ردّ الشبہات

اہل تشیع پر ہونے والے مشہور اعتراضات کے جوابات کا مجموعہ

تالیف:

سیّد توقیر عباس کاظمی

(جملہ حقوق بحق ناشر و مؤلف محفوظ ہیں)

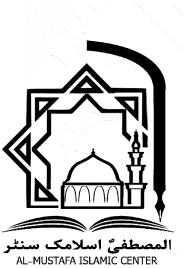

نام کتاب: رَدّ الشُبہات

(اہل تشیع پر ہونے والے مشہور اعتراضات کے جوابات کا مجموعہ)

مؤلف: سید توقیر عباس کاظمی

طبع: دوم

سال: ربیع الاول ۱۴۳۴ھ/جنوری ۲۰۱۳ء

صفحات: ۱۶۸

ہدیہ: ۲۰۰ روپیہ

تعاون: محمد و آل محمد علیہم السلام سوسائٹی و سادات و مومنین کھیالی گوجرانوالہ

ناشر: المصطفی اسلامک سنٹر گوجرانوالہ پاکستان

رابطہ: mic_grw@yahoo.com

بسم الله الرحمن الرحیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال النبي صلى الله عليه [وآله] وسلم: والذي نفسي بيده انّ هذا [عليّا] وشيعته لهم الفائزون يوم القيامة

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قسم اُس ذات کی جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، بے شک یہ [علیؑ] اور اسکے شیعہ ہی قیامت کے دن کامیاب و کامران ہیں''

(الدر المنثور، جلال الدين سيوطی، تفسیر سورہ بیّنة، آیت ۷)

فہرست موضوعات

مقدمہ ۷

سوال نمبر 1: لفظ شیعہ کے معنی کیا ہیں نیز شیعہ مذہب کی ابتدا کب ہوئی؟ ۹

سوال نمبر 2: عربی زبان میں ''مولیٰ'' کے معانی کیا ہیں نیز حدیث غدیر میں لفظ مولیٰ کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟ ۱۳

سوال نمبر 3: شیعہ، حضرت علیؑ کو رسول اکرمؐ کا بلافصل خلیفہ و جانشین کیوں مانتے ہیں؟ ۲۱

سوال نمبر 4: کیا حضرت علیؑ نے خلفاء ثلاثہ کی بیعت کی تھی؟ ۲۷

سوال نمبر 5: اہل بیتؑ سے مراد کون ہیں نیز کیا رسول خداؐ کی ازواج بھی آیت تطہیر میں شامل ہیں؟ ۳۳

سوال نمبر 6: حضرت علیؑ نے اپنے بیٹوں کے نام خلفاء کے ناموں پر کیوں رکھے؟ ۳۹

سوال نمبر 7: کیا خلیفہ اول اور دوم کا پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ دفن ہونا، اللہ تعالی کی رضایت کی دلیل ہے؟ ۴۵

سوال نمبر 8: کیا خلیفہ دوم نے حضرت علیؑ کی بیٹی ام کلثوم سے شادی کی تھی؟ ۵۱

سوال نمبر 9: حضرت علیؑ نے اپنی خلافت کے دوران فدک واپس کیوں نہ لیا؟ ۶۱

سوال نمبر 10: کیا شیعہ موجودہ قرآن مجید کو نہیں مانتے؟ ۶۷

سوال نمبر 11: شیعہ، وضو میں پاؤں پر مسح کیوں کرتے ہیں؟ ۷۱
سوال نمبر 12: شیعہ، ہاتھ کھول کر نماز کیوں پڑھتے ہیں؟ ۷۹
سوال نمبر 13: شیعہ، دو نمازیں ایک ساتھ کیوں پڑھتے ہیں؟ ۸۴
سوال نمبر 14: شیعہ، نماز میں مٹی پر سجدہ کیوں کرتے ہیں؟ ۸۷
سوال نمبر 15: کیا حضرت ابو طالبؑ مسلمان اور صاحب ایمان تھے؟ ۹۱
سوال نمبر 16: کیا نکاحِ متعہ جائز ہے؟ ۹۹
سوال نمبر 17: تقیہ سے کیا مراد ہے نیز کیا اسلام میں تقیہ جائز ہے؟ ۱۰۶
سوال نمبر 18: کیا یزید اور اُس جیسے دوسرے افراد پر لعنت نہیں کرنا چاہیے؟ ۱۱۱
سوال نمبر 19: کیا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام صحابہ عادل ہیں؟ ۱۱۷
سوال نمبر 20: کیا شیعہ، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کی توہین کرتے ہیں؟ ۱۲۳
سوال نمبر 21: کیا امام حسینؑ کے غم میں نوحہ و ماتم ناجائز اور حرام ہے؟ ۱۲۷
سوال نمبر 22: کیا امام علیؑ اور باقی آئمہ علیہم السلام، رسول اکرمؐ کے علاوہ تمام انبیاء سے افضل ہیں؟ ۱۳۷
سوال نمبر 23: کیا نماز تراویح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے؟ ۱۴۱
سوال نمبر 24: خلفاء راشدین کون ہیں؟ ۱۴۸
مسلمان بھائیوں سے دو سوال: ۱۵۱
کتاب کے مصادر ۱۵۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قال اللہ تعالیٰ: اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ أَحْسَنُ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ

''آپ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ دعوت دیں اور ان سے بہترین طریقہ سے بحث کریں بے شک خدا کے راستہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو تمہارا پروردگار خوب جانتا ہے، اور وہ ہدایت یافتہ لوگوں سے بھی واقف ہے'' ﴿سورۃ النحل (۱۶): آیت ۱۲۵﴾

عصر حاضر میں اسلام دشمن قوتیں اپنی پوری توانائیاں اسلام و مسلمین کو نابود کرنے پر صرف کر رہی ہیں، کبھی دہشتگری اور فرقہ واریت کے ذریعہ اسلام و مسلمین کو بدنام کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں، کبھی اسی مقصد کیلئے دین کی روح سے نابلد اور حقیقتِ اسلام کی سوجھ بوجھ سے عاری افراد کو استعمال کیا جا رہا ہے اور کبھی غیر مسلم اقوام، مسلمانوں کے جذبات مجروح کر رہی ہیں، ایسے حالات میں مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق، وحدت و یکانگت اور باہمی اخوت و محبت کی اشد ضرورت ہے تاکہ ہم سب شیعہ و غیر شیعہ مسلمان مل کر، اسلام دشمن قوتوں کی مکروہ سازشوں کو ناکام بنا سکیں اور دین اسلام کے اقتدار و سربلندی کا سبب بنیں۔

البتہ اس بات کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی مذاہب کے درمیان اکثر اختلافات کا ایک اہم سبب مسلمانوں کے درمیان موجود غلط فہمیاں ہیں لہذا جب تک یہ غلط فہمیاں دور نہ ہوں اُسوقت تک مسلمانوں کے درمیان باہمی اتفاق و اتحاد قائم نہیں ہوسکتا۔

اسی مقصد کے پیش نظر ہم نے اہل تشیع پر ہونے والے عوام میں مشہور اعتراضات کے جوابات

کونہایت سلیس اورمنفرد انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کی غرض محض حق کی اشاعت اور بعض ایسی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ہے جن کی بنا پر مسلمانوں کے اتحاد کا شیرازہ بکھر رہا ہے، اور ہمارا پختہ یقین ہے کہ افہام وتفہیم کے بغیر اتحاد بین المسلمین کا خواب ہرگز شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔

لہذا اس بات پر تاکید کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس تالیف کا مقصد نہ ہی مذہبی اختلافات کی بنیاد پر کسی مسلمان کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا ہے اور نہ ہی کسی دوسرے اسلامی مذہب کو اپنی تنقید کا نشانہ بنانا؛ بلکہ ہماری اس علمی کاوش کا بنیادی مقصد اہل سنت مسلمان بھائیوں کے اذہان کو شیعہ مذہب کے حوالے سے صاف کرنا اور شیعہ مومنین کے اذہان کو اُن کے مذہبی اعتقادات ونظریات کے حوالے سے یقینِ محکم اور اطمینانِ کامل کی منزل پر پہنچانا ہے۔

البتہ یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ اس مختصر کتاب میں ذکر شدہ سوالات کے جوابات نئے نہیں ہیں بلکہ مذہب حقّہ کی طرف سے ان سوالات کے جواب میں انتہائی مفصل کتب تحریر ہوئی ہیں لیکن چونکہ عوام الناس میں سے اکثر افراد، اتنے زیادہ مختلف موضوعات پر مفصل کتب خریدنے یا اتنی زیادہ تفصیلی کتب کے مطالعہ پر قادر نہیں ہیں کیونکہ اس کام کیلئے بیک وقت فراوان قیمت ادا کرنے اور مطالعہ کیلئے وسیع وقت کی ضرورت ہے، اسی بات کو مدّنظر رکھتے ہوئے ہم نے اس مختصر کتاب میں شیعہ مذہب پر ہونے والے مشہور اعتراضات کے جوابات کو نہایت اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ طالبانِ حقیقت پر کوئی بات مخفی نہ رہے۔

انشاء اللہ یہ مختصر کتاب قارئین کو بہت سی تفصیلی کتب سے بے نیاز کرتے ہوئے، حقیقت کے ساتھ آشنائی میں معاون ثابت ہوگی۔

والسلام علیکم ورحمة الله وبرکاته

سیّد توقیر عباس کاظمی

(E.mail:tqrkazmi@yahoo.com)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سوال نمبر 1:

لفظ شیعہ کے معنی کیا ہیں نیز شیعہ مذہب کی ابتدا کب ہوئی؟

لفظ شیعہ کے لغوی معنی: شیعہ یا تشیع عربی زبان کا لفظ ہے، اور یہ لفظ لغت کے لحاظ سے ''اطاعت واتباع''؛ ''ہم آہنگی و یکسانیت'' اور ''فرقہ وگروہ'' جیسے معانی کی طرف راہنمائی کرتا ہے، اور قرآن مجید میں بھی یہ لفظ، مذکورہ تینوں معنی میں استعمال ہوا ہے(۱):

۱: اطاعت واتباع: علماء لغت نے بیان کیا ہے: **شيعة الرجل أي اتباعه وانصاره** ''کسی کا شیعہ ہونا یعنی اُس کا پیروکار اور مددگار ہونا'' (۲)؛ صحاح اللغۃ میں ہے: ''تشیع یعنی پیروی کرنا'' (۳)؛ قرآن مجید میں بھی لفظ شیعہ اس معنی میں استعمال ہوا ہے چنانچہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿**فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هٰذَا مِنْ شِيعَتِه وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهٖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِي مِن عَدُوِّهٖ**﴾ ''اُس (موسیٰؑ) نے شہر میں دو افراد کو آپس میں لڑتے ہوئے پایا، ان میں سے ایک حضرت موسیٰؑ کے شیعوں میں سے تھا اور دوسرا آپؑ کے دشمنوں میں

---

(۱) قرآن مجید میں لفظ شیعہ اور اس کے مشتقات بارہ مرتبہ استعمال ہوئے ہیں: تَشِيْعَ ایک مرتبہ (سورہ نور (۲۴): آیت ۱۹)، شِيْعَةِ ایک مرتبہ (سورہ مریم: (۱۹) آیت ۶۹)، شِيْعَتِهٖ تین مرتبہ (سورہ قصص: (۲۸) آیت ۱۵؛ سورہ صافات (۳۷) آیت ۸۳) شِيَعِ، ایک مرتبہ (سورہ حجر (۱۵) آیت ۱۰) شِيَعًا چار مرتبہ (سورہ انعام (۶) آیات ۶۵، ۱۵۹؛ سورہ قصص (۲۸) آیت ۴؛ سورہ روم (۳۰): ۳۲) اَشْيَاعِكُمْ ایک مرتبہ (سورہ قمر (۵۴) آیت ۵۱) بِاَشْيَاعِهِمْ ایک مرتبہ (سورہ سبا: (۳۴) آیت ۵۴)۔

(۲) قاموس المحیط: مادة ''شَيَعَ'' (۳) صحاح اللغة (جوهری): ج ۳ ص ۱۵۶

سے تھا، تو جو آپؑ کا شیعہ تھا اُس نے دشمن کے خلاف حضرت موسیٰؑ کو اپنی مدد کیلئے پکارا (۱)۔
اس آیت مبارکہ میں حضرت موسیٰؑ کے پیروکار اور مطیع کو شیعہ کہا گیا ہے (۲)۔

۲: یکسانیت وہم آہنگی: جن دو افراد یا دو گروہ کے عقیدہ یا عمل میں یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جائے تو اُن میں سے عام طور پر دوسرے شخص کو پہلے شخص کا شیعہ کہا جاتا ہے لیکن ان دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کا پیروکار نہیں ہوتا؛ لفظ شیعہ کے اس معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالی نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: ﴿وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِیْمَ﴾ ''اور تحقیق ابرہیم اُس (نوح) کے شیعوں میں سے تھے'' (۳)۔

اس آیت مبارکہ میں حضرت ابراہیمؑ کو حضرت نوحؑ کا شیعہ کہا گیا ہے کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے دین کی تبلیغ کیلئے وہی روش اور طریقہ اختیار کیا جو حضرت نوحؑ کا تھا پس چونکہ ان دونوں انبیاء کے تبلیغ دین کے طریقہ کار میں یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جاتی تھی لہذا حضرت ابراہیمؑ کو حضرت نوحؑ کا شیعہ کہا گیا (۴)۔

۳: فرقہ اور گروہ: لغت کے لحاظ سے شیعہ کا ایک معنی فرقہ اور گروہ ہے، جیسے اللہ تعالی نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا: ﴿ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا﴾ (۵) ''پھر

---

(۱) سورہ القصص (۲۸) آیت ۱۵

(۲) اس معنی میں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ پیروی کرنے والا کسی مثبت اور الہی رہبر کی پیروی کرے یا پیروی کرنے والا خود مثبت شخص ہو، اسی لئے ابوسفیان کے خاندان کی پیروی کرنے والوں کو ''شیعہ ءآل ابی سفیان'' اور جنگ نہروان میں حاکم شام معاویہ بن ابوسفیان کے لشکر میں شامل ہو کر حضرت علیؑ سے جنگ کرنے والوں کو ''شیعہ ءمعاویہ'' کہا گیا؛ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام کی پیروی کرنے والے ''شیعہ ءعلیؑ'' کے نام سے پکارے گئے۔

(۳) سورہ صافات (۳۷) آیت ۸۳. (۴) مجمع البیان (طبرسی) تفسیر آیت مذکور.

(۵) سورہ مریم (۱۹) آیت ۶۹.

ہم ضرور ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو الگ کریں گے جو خدائے رحمٰن کے خلاف سب سے زیادہ سرکش رہا ہوگا''؛ اس آیت میں لفظ شیعہ، فرقہ اور گروہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

لفظ شیعہ کے مذکورہ تین معنی میں سے پہلا معنی زیادہ مشہور ہے اور جب کوئی خاص قرینہ نہ ہو تو اس لفظ سے پہلا معنی ہی سمجھا جاتا ہے۔

لفظ شیعہ کے اصطلاحی معنی:

اسلامی معاشرے میں لفظ شیعہ، کسی شخص کی حضرت علیؑ اور اہل بیت علیہم السلام کے ساتھ خاص عقیدت ومحبت اور اطاعت وپیروی کے معنی کو ظاہر کرتا ہے، البتہ اصطلاح میں شیعہ اُن افراد کو کہا جاتا ہے جو:

۱: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت علی علیہ السلام کی بلافصل امامت کا عقیدہ رکھتے ہوں اور یہ کہ حضرت علی علیہ السلام اور حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کے معصوم بیٹے ہی امت کے امام ہیں۔

۲: دین میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپؐ کی عترت واہل بیت علیہم السلام کے پیروکار رہوں۔

۳: حضرت علی علیہ السلام کی باقی تمام اصحاب پر افضلیت کا عقیدہ رکھتے ہوں۔

۴: اہل بیت علیہم السلام سے محبت ومودت رکھتے ہوں۔

قابل توجہ بات یہ ہے کہ رسول اکرمؐ کی زبانی بھی لفظ شیعہ ایسے افراد کیلئے استعمال ہوا ہے کہ جو حضرت علی علیہ السلام سے عقیدت ومحبت رکھتے تھے اور ہمیشہ آپؑ ہی کے تابع رہے جیسا کہ اہل سنت کے معتبر مفسر جلال الدین سیوطی نے بیان کیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کی طرف دیکھ کر فرمایا: **والذي نفسي بيده انّ هذا وشيعته لهم الفائزون يوم القيامة** (۱) ''قسم ہے اُس ذات کی جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، بے شک یہ [علیؑ] اور اسکے شیعہ ہی

---

(۱) الدر المنثور (جلال الدين سيوطی)، تفسیر سورہ بیّنة، آیت ۷.

قیامت کے دن کامیاب وکامران ہیں''۔

شیعہ مذہب کی ابتداء:

چونکہ لفظ شیعہ قرآن مجید میں بھی استعمال ہوا ہے اور پیغمبر اکرمؐ نے بھی اپنی زبان مبارک سے حضرت علی علیہ السلام کے مطیع اور آپؑ کے ساتھ محبت کرنے والوں کو شیعہ کا نام دیا ہے، اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ سب سے پہلے اللہ تعالی نے قرآن مجید میں تشیع کا بیج بویا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں اس کی آبیاری کی، یہی وجہ ہے کہ تشیع کا شجرہ طیبہ آپؐ کی حیات مبارکہ ہی میں پروان چڑھا اور ثمر آور بنا، لہذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہی میں بہت سے صحابہ کرامؓ ''شیعہ'' کے نام سے معروف ہوئے جیسے حضرت سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد بن اسود...وغیرہ

اس دعوی کی واضح دلیل پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ احادیث ہیں جنہیں شیعہ علماء کے علاوہ بہت سے اہل سنت علماء ومفسرین نے بھی نقل کیا ہے، ان احادیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کے شیعوں کو کامیابی وکامرانی اور جنت کی بشارت دی ہے۔

پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تشیع کے شجرہ طیبہ کے استحکام کیلئے غدیر خم کے موقع پر حضرت علیؑ کی ولایت وامامت کا اعلان فرمایا، اور پھر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد سقیفہ کے واقعہ کے نتیجہ میں جب امتِ اسلام دو گروہ(۱) میں تقسیم ہوئی تو اُسوقت جناب ابوبکر کی بیعت سے منہ موڑ کر حضرت علی علیہ السلام کی حمایت کرنے والے اور آپؑ کی بیعت پر اصرار کرنے والے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دیئے ہوئے مبارک نام ''شیعہ'' سے مشہور ہو گئے اور پھر یہی گروہ نہایت معتبر اسلامی مذہب ''امامیہ'' کے نام سے مشہور ہوا۔

---

(۱) ایک گروہ حضرت علیؑ کو خلافت کا حقدار سمجھتے ہوئے آپؑ کی حمایت کرنے والوں کا تھا جبکہ دوسرے گروہ میں جناب ابوبکر کی بیعت کرنے والے شامل تھے، البتہ ان کے علاوہ وقتی طور پر ایک تیسرا گروہ بھی بنا جس نے سعد بن عبادہ کی خلافت کا دعوا کیا تھا۔

سوال نمبر 2:

عربی زبان میں ''مولیٰ'' کے معانی کیا ہیں نیز حدیث غدیر میں لفظ مولیٰ کس معنی میں استعمال ہوا ہے؟

عربی لغت کے لحاظ سے لفظ ''مولیٰ'' کے سولہ معانی ہیں:

۱:**مالک**؛ **۲**:رَب؛ **۳**:مُعْتِقُ (آزاد کرنے والا)؛ **۴**:مُعْتَقُ (آزاد شدہ)؛ **۵**:ہمسایہ و پڑوسی؛ **۶**: خلف وقدام (یعنی پیچھے والا اور سامنے والا)؛ **۷**: تابع و پیروکار؛ **۸**: ضامن جریرہ (یعنی وہ شخص کہ جس کے ساتھ قسم کے ذریعہ وعدہ کیا گیا ہو)؛ **۹**: داماد؛ **۱۰**: چچا کا بیٹا؛ **۱۱**:مُنْعِمُ (نعمت عطا کرنے والا)؛ **۱۲**: مُنْعَمُ (جس کو نعمت عطا کی گئی ہو)؛ **۱۳**: محبّ اور دوست؛ **۱۴**: ناصر و مددگار؛ **۱۵**: آقا و سردار؛ **۱۶**:**اولی بالتصرف** یعنی تمام امور میں تصرف کا حق رکھنے والا۔

جب بھی کسی جملہ میں متعدد معانی رکھنے والا لفظ استعمال ہو تو اسکے صحیح معنی کی شناخت کیلئے لفظی یا عقلی قرائن کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، لہذا مشہور و معروف اور متواتر حدیث غدیر ''**من کنت مولاہ فھذا علیّ مولاہ**'' میں بھی، لفظ مولی کے صحیح معنی کی شناخت کیلئے انہی قرائن کو مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

واضح رہے کہ لفظ مولی کے ذکر شدہ معانی میں سے پہلے بارہ معانی، حدیث غدیر میں لفظ مولی کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتے اور نہ ہی مذکورہ حدیث سے انکا کوئی تعلق ہے، البتہ تیرہواں اور چودھواں معنی ''یعنی دوست اور مددگار'' حدیث غدیر سے مناسبت ضرور رکھتا ہے لیکن:

اوّل: کوئی ایسا لفظی یا عقلی قرینہ موجود نہیں ہے جس سے واضح ہو کہ حدیث غدیر میں یہی معنی (یعنی

دوست اور مددگار) مراد لیا گیا ہے۔

دوم: یہ دو معانی صرف رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علیؑ کے ساتھ مختص نہیں بلکہ تمام مومنین کے درمیان مشترک ہیں، یعنی تمام مومنین آپس میں ایکدوسرے کے دوست ہیں جیسا کہ قرآن مجید نے ارشاد فرمایا: ﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ...﴾ (۱) ''اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست اور ولی ہیں''۔

سوم: ایسے قطعی اور یقینی قرائن موجود ہیں جن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حدیث غدیر میں دوست و مددگار کے معنی مراد نہیں ہیں بلکہ اس حدیث میں پندرہواں اور سولہواں معنی (یعنی سید وسردار اور انسان کے تمام امور میں تصرف کا حق رکھنے والا) ہی مراد ہیں، جو دونوں تقریبا ایک ہی مفہوم بیان کرتے ہوئے حضرت علیؑ کی ولایت وامامت پر دلالت کرتے ہیں، ذیل میں اُن لفظی وعقلی قرائن کو بیان کیا جاتا ہے جن سے مذکورہ مطلب کی تائید ہوتی ہے۔

لفظی قرائن:

1: سب سے پہلا قرینہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ سوالیہ جملہ ہے جو آپؐ نے غدیر خم کے مقام پر خطبہ دیتے ہوئے حضرت علیؑ کی ولایت وامامت کے اعلان سے پہلے ادا فرمایا اور پوچھا: **ألست اولی بکم من أنفسکم** ''کیا میں تم لوگوں پر تمہاری جانوں سے زیادہ حق نہیں رکھتا؟'' (۲)؛

---

(۱) سورہ توبہ (۹) آیت ۷۱.

(۲) خطبہ غدیر؛ مستدرک میں روایت ہے: فاخذ بيد علي رضي الله عنه فقال: يا ايها الناس مَن اولى بكم من أنفسكم قالوا: الله ورسوله أعلم، قال: من كنت مولاه فعلي مولاه، پھر حاکم کہتے ہیں: هذا حديث صحيح الاسناد ولم يخرجاه '' یہ حدیث سند کے لحاظ سے صحیح ہے لیکن صحیحین نے نقل نہیں کی (مستدرک حاکم: كتاب معرفة الصحابة، باب غزازيد مع النبي سبع عشرة غزوة، ج ۳ ص ۵۳۳)؛ ابن اثیر کی روایت کے مطابق رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ايها الناس أتعلمون أني اولى بكم من انفسكم قالوا: نعم قال فمن كنت (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سب نے مل کر جواب دیا: بلیٰ ''یارسول اللہ ﷺ آپ یہ حق رکھتے ہیں'' پھر آپؐ نے فرمایا: من کنت مولاہ ...؛ پس آپؐ کا یہ سوالیہ جملہ واضح لفظی قرینہ ہے کہ من کنت مولاہ کے اعلان میں مولی سے آپؐ کی مراد وہی آخری معنی ہے کہ جو حضرت علیؑ کی خلافت وامامت پر دلالت کرتا ہے، وگرنہ ألستُ أولی بکم من أنفسکم کے جملہ کے بعد من کنت مولاہ کے اعلان میں کوئی اور معنی مراد لینا عربی استعمال اور فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے غلط ہے(۱)۔

2: دوسرا قرینہ جناب عمر بن خطاب کا یہ قول ہے جو انہوں نے حضرت علیؑ کی ولایت کے اعلان کے فورا بعد کہا: بخ بخ لک یابن أبي طالب، أصبحتَ مولاي ومولی کلّ مؤمن ومؤمنة (۲) ''اے ابوطالب کے بیٹے تجھے مبارک ہو مبارک ہو، آپ میرے اور ہر مومن اور مومنہ کے مولی بن گئے''؛ اہل سنت کے بعض معتبر علماء نے واضح اقرار کیا ہے کہ: حضرت عمر کے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ حاشیہ) مولاہ فعلي مولاہ اللھم وال من والاہ وعاد من عاداہ (أسد الغابة(ابن الاثیر): ج ۱ ص ۳۶۷)؛ بلاذری روایت کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: یا ایھا الناس ألستم تشھدون ان اللہ ورسولہ اولی بکم من انفسکم؟ وان اللہ ورسولہ مولیاکم؟ قالوا: بلی، قال: فمن کنت مولاہ فان علیا مولاہ (انساب الاشراف(بلاذری) ص ۱۱۱).

(۱) اس مطلب کی تائید بعض احادیث سے بھی ملتی ہے چنانچہ ینابیع المودۃ میں ہے کہ من کنت مولاہ کے اعلان کے بعد حضرت سلمان نے رسول خدا ﷺ سے اس اعلان کی وضاحت طلب کی تو آپؐ نے فرمایا: ولاؤہ کولائی من کنت أولی بہ من نفسہ فعلي أولی بہ من نفسہ ''علیؑ کی ولایت میری ولایت کی مانند ہے، میں جس شخص پر اُس کے نفس سے زیادہ اولویت رکھتا ہوں علیؑ بھی اُس شخص پر اُس کے نفس سے زیادہ اولویت رکھتا ہے'' (ینابیع المودۃ (قندوزی) ج ۱ ص ۳۴۷)

(۲) شواھد التنزیل (حسکانی) ج ۱ ص ۲۰۰؛ البدایۃ والنھایۃ (ابن کثیر) ج ۷ ص ۳۸۶، حدیث غدیر خم؛ سیر اعلام النبلاء (ذھبی) ج ۱۹ ص ۳۲۸؛ تاریخ بغداد (خطیب بغدادی) ج ۸ ص ۲۸۴، باب ذکر الاسماء المفردۃ؛ تاریخ مدینۃ دمشق (ابن عساکر) ج ۴۲ ص ۲۳۳؛ ینابیع المودۃ (قندوزی حنفی) ج ۲ ص ۲۴۹؛ المناقب (خوارزمی) ص ۱۵۶، فصل ۱۴.

اس کلام میں مولی کا معنیٰ ''ولی (سرپرست)'' ہے(۱)۔

3: تیسرا قرینہ اُسوقت کے مشہور عرب شاعر اور رسول خدا ﷺ کے صحابی حضرت حسان بن ثابت کا غدیرخم کے بارے میں وہ قصیدہ ہے جو شیعہ وسنی مؤرخین کے نزدیک مشہور ہے اور جس کا ایک شعر یہ ہے:

فقال له قم ياعلي فانّني رضيتک من بعدي اماما وهاديا(۲)

''پس آپؐ نے علیؑ سے فرمایا: اے علی کھڑے ہوجاؤ میں اس بات پر راضی ہوں کہ تم میرے بعد امام اور ہادی ہو''

پس اس سے معلوم ہوا کہ غدیرخم کے موقع پر موجود حسان بن ثابت کی طرح باقی افراد نے بھی **من کنت مولاہ** کے اعلان سے حضرت علیؑ کے اولی بالتصرف ہونے کو ہی سمجھا ہے کہ جس سے آپؑ کی امامت وخلافت مراد ہے۔

4: چوتھا قرینہ پیغمبر اکرم ﷺ کا وہ واضح فرمان ہے جس میں آپؐ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: **أنت امام كلّ مومن ومؤمنة بعدي ووليّ كلّ مؤمن ومؤمنة بعدي** ''اے علی تم میرے بعد ہر مومن اور مومنہ کے امام اور ولی ہو''(۳)۔

اسی طرح اہل سنت کے بہت سے معتبر علماء نے کئی ایسی روایات بیان کی ہیں جن میں پیغمبر اکرمؐ

---

(۱) وقول عمر لعلي:''أصبحت مولى كلّ مؤمن'' أي وليّ كلّ مؤمن (النهاية في غريب الحديث (ابن الاثير): ج۵ ص۲۲۸)

(۲) مناقب آل ابی طالب (ابن شهر آشوب) ج۲ ص۲۲۰، باب النصوص على امامة عليؑ؛ شواهد التنزيل (حاكم حسكانی) ج۱ ص۲۰۲؛ المناقب (خوارزمی) فصل ۱۴، ص۱۳۶.

(۳) اس جملہ کو اخطب خوارزمی نے غدیرخُم کے بارے روایات میں، زید بن ارقم، عبدالرحمان بن ابی لیلی اور ابن عباس سے نقل کیا ہے۔

کے بعض اصحاب نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر حضرت علیؑ کی شکایت کرنا چاہی تو آپؐ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا اور آپؐ نے حدیث غدیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: **لاتقل هذا فهو (عليٌ) أولى الناس بكم بعدي** (۱)؛ ''یہ بات (یعنی علیؑ پر اعتراض) مت کرو، جان لو کہ وہ (علیؑ) میرے بعد تمہارے درمیان لوگوں سے میں سب سے اولی ہیں''۔

اسی طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ایک صحابی سے پوچھا: ''اے برید! کیا میں مومنین کے نفسوں سے زیادہ حق نہیں رکھتا؟ میں نے کہا: ہاں، یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، پس آپؐ نے فرمایا: جس کا میں مولی ہوں پس اُس کا علی بھی مولی ہے، بے شک میرے بعد تمہارے درمیان لوگوں سے میں سب سے اولی علیؑ ہیں''۔

5: قرآن مجید کی آیت'' **بـلّـغ** ''پر غور کرنے سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ غدیر کے اعلان میں مولی سے مراد دوست نہیں ہے، جیسا کہ خداوند نے ارشاد فرمایا: ﴿**يَـا أيّهَـا الـرَّسُـولُ بَلِّغْ مَاأُنْزِلَ اِلَيْکَ مِنْ رَبِّکَ وَاِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ**...﴾(۲).

''اے رسول جو کچھ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہاری طرف نازل کیا گیا ہے اُسے پہنچا دیں، اور اگر ایسا نہ کیا پس گویا آپ نے خدا کے کسی پیغام کو نہیں پہنچایا...''۔

اہل سنت کے بہت سے معتبر مفسرین نے بیان کیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غدیر کے مقام پر حضرت علیؑ کی ولایت کا اعلان فرمایا تو اسی دن یہ آیت نازل ہوئی جس میں خداوند نے ارشاد فرمایا: ﴿**اَلْيَـوْمَ اکْـمَـلْـتُ لَـکُـمْ دِيْـنَکُمْ**...﴾(۳) ''آج میں نے

---

(۱)معجم کبیر (طبرانی) ج۲۲ص۱۳۵،روایات وهب بن حمزة؛ مجمع الزوائد(هیثمی) ج۹ ص ۱۰۹، باب منزلة علیؑ؛ کنزالعمال(متقی هندی) ج ۱۱ ص ۶۱۳؛ فیض القدیر(مناوی) ج۴ص ۴۷۱، حرف العین.

(۲)سوره مائده(۵) :آیت ۶۷. (۳) سوره مائده(۵) :آیت ۳.

تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا...اس کے بعد خاتم الانبیاءؐ نے فرمایا: ''**الله اكبر على اكمال الدين، واتمام النعمة، ورضي الرب برسالتي، والولاية لعليّ من بعدي**''.

6: اہل سنت مفسرین نے بیان کیا ہے کہ جب پیغمبر اکرم ﷺ نے حضرت علیؑ کی ولایت کا اعلان فرمایا تو حارث بن نعمان فہری نے حضرت علیؑ کی ولایت کا انکار کیا اور ہٹ دھرمی سے کام لیتے ہوئے عذاب کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالی کی طرف سے اُس پر عذاب نازل ہوا، اور اس کی مذمت میں یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی: ﴿سَئَلَ سَائِلٌ بِعَذَابٍ وَاقِعٍ﴾ ''ایک سوال کرنے والے نے واقع ہونے والے عذاب کا سوال کیا'' (۱)۔

اہل اسلام کی معتبر تفاسیر میں مذکورہ آیات کے شان نزول سے بھی یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ مولی سے مراد ''اولی بہ تصرف'' ہے اور یہ معنی امامت وخلافت کے منصب کی طرف رہنمائی ہے۔

7: بعض معتبر اہل سنت علماء نے بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؑ نے مسجد کوفہ کے منبر پر کھڑے ہو کر مہاجرین وانصار کو قسم دی کہ جس جس نے غدیر خُم کے دن رسول خدا ﷺ کا میرے بارے میں اعلان سنا ہے وہ کھڑا ہو کر گواہی دے، جس کے نتیجہ میں تیس صحابہ کرام (جن میں ۱۲ بدری صحابی تھے) نے کھڑے ہو کر گواہی دی (۲)، کہ اُس دن رسول خدا ﷺ نے آپ (حضرت علیؑ) کا بازو

---

(۱) سورہ معارج (۷۰): آیت ۱.

(۲) یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے کئی سال بعد سنہ ۲۵ ہجری کو رحبہ (کوفہ) میں پیش آیا، اُسوقت غدیر خم میں موجود بہت سے صحابہ کرام وفات پا چکے تھے اور جو صحابہ زندہ تھے اُن میں سے بھی اکثر افراد دوسرے مختلف شہروں میں زندگی گزار رہے تھے اور چونکہ صحابہ کا اصلی وطن مدینہ تھا جبکہ عراق، رسول اللہ ﷺ کی وفات کے کچھ عرصہ بعد فتح ہوا تھا اس لیے بھی وہاں صحابہ کی تعداد بہت کم تھی اور یہ کہ گواہی طلبی کا یہ واقعہ اتفاقی طور پر پیش آیا جس کے لئے لوگوں کو پہلے سے تیار نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی صحابہ کرام کو اس گواہی کے لیے باقاعدہ دعوت دی گئی تھی اس کے باوجود بہت سے صحابہ کرام نے گواہی دی، البتہ حاضرین میں سے ایک صحابی زید بن ارقم نے گواہی چھپائی تو حضرت علیؑ نے اُن کے لیے بددعا کی جس سے اُن کی بینائی چلی گئی اور وہ اندھے ہو گئے۔

تھام کر بلند کیا اور فرمایا: **أتعلمون انّي اولى بالمؤمنين من أنفسهم؟ قالوا بلى يارسول اللہ** ﷺ ''کیا تم جانتے ہو کہ میں مومنین پر اُن کے نفوس سے زیادہ حق رکھتا ہوں؟ سب صحابہ نے کہا: ہاں یارسول اللہ ﷺ''، پھر پیغمبر اکرم ﷺ نے آپؑ (حضرت علیؑ) کا ہاتھ تھام کر بلند کیا اور فرمایا: **من كنت مولاه فعليّ مولاه**۔

واضح ہے کہ اگر غدیر کے اعلان میں مولی سے مراد ''دوست'' ہوتا تو حضرت علیؑ کا رسول اکرمؐ کے اصحاب کو قسم دے کر گواہی لینا فضول تھا اور اس صورت میں **من كنت مولاه فعليّ مولاه** کے فرمان سے حضرت علیؑ کی کوئی فضیلت ثابت نہ ہوتی تھی کیونکہ تمام مسلمان اور مومن آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور بھائی ہیں۔

8: بہت سے اہل سنت مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ اعلان غدیر کے بعد رسول خدا ﷺ نے حضرت علیؑ کے لیے ایک مخصوص خیمہ نصب کروایا اور پھر اپنے تمام صحابہ کو حکم دیا کہ وہ حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کریں۔

پس ان تمام قرائن سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غدیر میں حضرت علیؑ کی امامت اور ولایت کا اعلان ہوا تھا۔

چہارم: عقلی طور پر یہ بات ہرگز قابلِ قبول نہیں ہے کہ رسول خدا ﷺ حضرت علیؑ کی دوستی کے اعلان کیلئے اپنے اصحاب کی ایک کثیر تعداد کو عرب کے گرم صحرا میں ظہر کے وقت عین گرمی کی شدت کے عالم میں روک لیں، وہاں سے آگے نکل جانے والوں کو واپس بلائیں اور پیچھے رہ جانے والوں کے آنے کا انتظار کریں اور جب تمام اصحاب جمع ہو جائیں تو اُونٹوں کے پلانوں کا منبر بنا کر ایک طویل خطبہ ارشاد فرمانے کے بعد حضرت علیؑ کا بازو تھام کر بلند کریں اور پھر یہ تاکید بھی فرمائیں کہ **فليبلّغ الشاهد الغائب** ''جو حاضر ہیں وہ دوسرے لوگوں تک بھی یہ پیغام پہنچائیں''۔

کیا کوئی عاقل شخص اس بات کو قبول کرے گا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علیؑ کی دوستی کے ایسے عام اور سادہ سے اعلان کیلئے اتنا اہتمام کریں، جبکہ اس سے پہلے قرآن مجید میں واضح اعلان بھی ہو چکا ہو کہ ہر مومن دوسرے مومن کا دوست ہے؟!!!

اور کیا یہ ممکن ہے کہ حضرت علیؑ کی صرف دوستی کے اعلان پر دوسرے خلیفہ اتنے پُر جوش ہو جائیں کہ سب سے آگے بڑھ کر بَـــخٍ بَـــخٍ (یعنی مبارک ہو، مبارک ہو) کہہ کر حضرت علیؑ کو مبارکباد دیں؟!

ان تمام عقلی قرائن سے یہی بات واضح ہوتی ہے کہ **من کنت مولاہ فعليّ مولاہ** کے اعلان سے، پیغمبر اکرمؐ کی مراد حضرت علیؑ کی امامت وخلافت کا اعلان تھا اور اُسوقت تمام حاضرین (اصحاب) نے بھی آپؐ کے اس اعلان سے یہی معنی سمجھا تھا۔

پنجم: اہل سنت کے معتبر حنفی عالم نے لفظ ''مولیٰ'' پر تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان ''**من کنت مولاہ فعليّ مولاہ**'' میں مولیٰ سے مراد معاشرے کی ولایت وسرپرستی کے مسئلہ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے؛ پھر لکھتے ہیں: امیر المومنینؑ کی امامت کا مسئلہ منصوص ہے اور اس بارے میں نبی اکرمؐ کا قول نص ہے یعنی صریح وآشکار ہے جس میں ابہام اور مجاز گوئی کا کوئی احتمال نہیں ہے(۱)۔

---

(۱) تذکرۃ الخواص (ابن جوزی): ص ۲۹۔۳۰

سوال نمبر 3:

شیعہ، حضرت علیؑ کو رسول خدا ﷺ کا بلافصل خلیفہ وجانشین کیوں مانتے ہیں؟

شیعہ حضرات خلفاء ثلاثہ کی خلافت اور جانشینی رسول ﷺ کا انکار کرتے ہوئے حضرت علیؑ کو آپؐ کا بلافصل خلیفہ اور جانشین کیوں مانتے ہیں؟

جواب: پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد اگرچہ ظاہری حکومت اور تختِ خلافت جناب ابوبکر اور پھر جناب عمر اور ان کے بعد جناب عثمان نے سنبھالا، لیکن اہل تشیع کا عقیدہ ہے کہ رسول خدا ﷺ کے بعد آپؐ کے حقیقی خلیفہ اور جانشین حضرت علیؑ ہی ہیں کیونکہ قرآنی آیات کے ساتھ ساتھ اہل سنت کی معتبر کتب میں موجود روایات واحادیث بھی اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ نے مختلف مقامات پر بہت سے فرامین وارشادات کے ذریعہ، واضح طور پر حضرت علیؑ کو اپنا خلیفہ اور جانشین نامزد کیا تھا، ذیل میں اسی عقیدہ کے چند دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

اول: دعوت ذوالعشیرہ: جب آیت مبارکہ ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾(۱) نازل ہوئی تو رسول خدا ﷺ نے تمام قریش کی دعوت کی اور انہیں اسلام کا پیغام پہنچایا اور پھر تمام حاضرین کے سامنے حضرت علیؑ کے شانے پر ہاتھ رکھ کے فرمایا: انّ هذا أخي و وصيّي و خليفتي فيكم فاسمعوا له وأطيعوا ''یقیناً یہ علی میرا بھائی، میرا وصی اور تمہارے درمیان میرا خلیفہ ہے،

---

(۱) اور اے رسول تم اپنے اقرباء کو (اللہ کے عذاب سے) ڈراؤ (سورہ شعرا: آیت ۲۱۴)

پس اس کی بات سنو اور اطاعت کرو''(۱)۔

دوم: آیت تبلیغ اور حدیث غدیر: اللہ تعالی نے سورہ مائدہ کی ایک آیت میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت علیؑ کی خلافت وجانشینی کے اعلان کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: ﴿ يَاأَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَاأُنزِلَ اِلَيکَ مِنْ رَبّکَ فَاِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللّٰهُ يَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ ﴾''اے رسول وہ پیغام پہنچا دو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا، پس اگر تم یہ کام نہ کروتو تم نے اس (خداوند) کی رسالت کا کوئی کام انجام نہیں دیا، اور اللہ تمہیں لوگوں سے محفوظ رکھے گا''(۲)۔

اس آیت مبارکہ کے نزول کے بعد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج الوداع سے واپسی کے موقعہ پر

---

(۱) تاریخ الامم والملوک(طبری) ج۲ ص۶۳؛ کنز العمال(متقی ھندی) ج۱۳ ص۱۳۳؛ شرح نھج البلاغہ (ابن ابی الحدید) ج۱۳ ص ۲۱۱. قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ بعض اہل سنت مفسرین اور محدثین نے مندرجہ بالا روایت سے وصیّي وخليفتي کے الفاظ کو حذف کرتے ہوئے یوں بیان کیا ہے: انّ ھذا أخي وکذا وکذا، فاسمعوا له وأطيعوا ،(جامع البیان،ابن جریر طبری: ج۱۹ ص۱۴۹؛ البداية والنهاية (ابن کثیر): ج۳ص۵۳)مذکورہ روایت میں اس تحریف سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ جب کچھ افراد نے محسوس کیا کہ یہ روایت حضرت علیؑ کی خلافت پر دلالت کررہی ہے تو انہوں نے اس سے وصیی وخلیفتی کے الفاظ کو حذف کردیا۔

یہاں ایک دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ جب جناب ابوبکر نے جناب عمر کی خلافت کا اعلان کیا تو کہا: أترضون بمن استخلف عليكم ... انی قد استخلفت عمر بن الخطاب فاسمعوا له وأطيعوا، فقالوا سمعنا و أطعنا '' جسے میں تمہارا خلیفہ قرار دوں کیا تم اُس سے راضی ہوں گے... یقیناً میں نے عمر بن خطاب کو خلیفہ قرار دیا ہے لہذا تم سب اُس کی بات سنو اور اُس کی اطاعت کرو، انہوں نے کہا: ہم نے سن لیا اور پیروی کی''(تاریخ طبری: ج۲ص۶۱۸، سنہ۱۳ ہجری کے حالات)؛ کیا یہ عجیب طرز تفکر نہیں ہے کہ اگر جناب ابوبکر جناب عمر بن خطاب کے لئے فاسمعوا له وأطيعوا ''تم سب اُس کی بات سنو اور اُس کی اطاعت کرو'' کا حکم دیں تو وہ خلیفہ برحق قرار پائیں لیکن اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعوت ذوالعشیرہ میں حضرت علی علیہ السلام کے لئے یہی حکم دیں تو وہ خلیفہ قرار نہ پائیں؟!!!

(۲) سورہ مائدہ(۵) : آیت ۶۷.

غدیر کے مقام پر ایک لاکھ بیس ہزار اصحاب کے مجمع میں، حضرت علیؑ کا بازو پکڑ کر بلند کر کے فرمایا: **من کنت مولاہ فھذا علی مولاہ** ''جس جس کا میں مولی ہوں اس اس کا علیؑ مولی ہے'' (۱)۔

حضرت علیؑ کی ولایت کے اعلان کے بعد جناب عمر آگے بڑھے اور حضرت علیؑ کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا: **بخٍ بخٍ لک یابن أبي طالب أصبحتَ مولاي ومولی کلّ مومنٍ ومومنةٍ** ''اے ابوطالب کے بیٹے آپ کو مبارک ہو مبارک ہو، آپ میرے بھی مولی بن گئے اور ہر مومن ومومنہ کے بھی مولی بن گئے'' (۲)۔

سوم: آیت ولایت: قرآن مجید کی محکم آیات میں سے ایک ''آیتِ ولایت'' ہے جو اکثر اہل سنت مفسرین کے مطابق حضرت علیؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے، جس میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿**اِنّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهُ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلَاةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکَاةَ وَهُمْ رَاکِعُوْنَ. وَمَنْ یَتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الغَالِبُوْنَ**﴾ ''تمہارا ولی (سرپرست) اللہ ہے اور اسکا رسول اور وہ صاحبان ایمان جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوۃ دیتے ہیں. اور جو اللہ، اسکے رسول اور صاحبان ایمان کو اپنا ولی بنائے تو پس اللہ کا گروہ ہی غالب ہے'' (۳)؛ بہت سے اہل سنت مفسرین ومحدثین نے بیان کیا ہے کہ یہ آیت

---

(۱) سنن الترمذی، ابواب المناقب، باب مناقب علی بن أبی طالب؛ مسند (احمد بن حنبل) ج ۱ ص ۷۹ مسند علی بن ابی طالب؛ المستدرک علی الصحیحین (حاکم نیشاپوری) ج۳ص ۱۰۹، ذکر بعض فضائل علی؛ فتح الباری (ابن حجرعسقلانی) ج۷ص ۶۱، مناقب علی بن أبی طالب؛ السنن الکبری (نسائی) کتاب المناقب، باب فضائل علی، نیز یہ حدیث اہل سنت کی دوسری بہت سی کتب میں بھی نقل ہوئی ہے۔

(۲) شواهد التنزیل (حاکم حسکانی حنفی) ج ۱ ص ۲۰۰؛ تاریخ بغداد (خطیب بغدادی) ج۸ص ۲۸۴؛ البدایة والنهایة (ابن کثیر) ج۷ص ۳۸۶؛ ینابیع المودة (قندوزی حنفی) ج۲ص ۲۴۹.

(۳) سورہ مائدہ(۵) : آیات ۵۵، ۵۶.

مبارکہ حضرت علیؑ کی شان میں اُسوقت نازل ہوئی جب آپؑ نے رکوع کی حالت میں ایک سائل کو اپنی انگوٹھی صدقہ میں دی(۱)؛ پس اس آیت مبارکہ میں اللہ اور رسول خداؐ کے ساتھ ساتھ حضرت علیؑ کی ولایت کا اعلان کیا گیا ہے۔

چنانچہ بعض اہل سنت مفسرین ومحدثین نے بیان کیا ہے: **وقف علی علي بن أبي طالب سائل وهو راكع في تطوع، فنزع خاتمه فأعطاه السائل، فأتى رسول الله ﷺ فأعلمه ذلک، فنزلت على النبی ﷺ هذه الآية (اِنّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ الخ) فقرأها رسول الله ﷺ ثم قال: من كنت مولاه فعلي مولاه اللهم وال من والاه وعاد من عاداه** ''علی بن ابی طالبؑ نماز میں رکوع کی حالت میں تھے کہ ایک سائل نے آپ سے سوال کیا، حضرت علیؑ نے اپنی انگوٹھی اتاری اور سائل کو دے دی، سائل رسول خدا کے پاس آیا اور آپؐ کو ماجرا سنایا، پھر نبی اکرمؐ پر آیت ولایت نازل ہوئی، رسول خداﷺ نے یہ آیت تلاوت کی اور پھر فرمایا: جس جس کا میں مولی ہوں اُس اُس کا علیؑ مولی ہے، خدایا جو علیؑ سے محبت رکھے اُس سے محبت رکھ اور جو علیؑ سے دشمنی کرے اُس سے دشمنی رکھ''(۲)۔

پس ان قطعی دلائل اور پیغمبر اکرمﷺ کے واضح فرمان کے بعد حضرت علیؑ کی ولایت وخلافت سے منہ موڑ کر کسی اور کو خلیفہ ماننا کیسے صحیح ہے جبکہ رسول خداﷺ حضرت علیؑ کی خلافت و ولایت کا اعلان کر کے گئے تھے؟!۔

---

(۱) الدر المنثور (سیوطی) آیت کے ذیل میں؛ تفسیر جامع البیان (طبری): ج۶ ص ۳۸۹، ۳۹۰، آیت کے ذیل میں؛ تفسیر القرآن (ابن کثیر) آیت کے ذیل میں؛ شواهد التنزيل (حاكم حسكانی حنفی): ج ۱ ص ۲۱۲؛ ينابيع المودة (قندوزی حنفی)؛ الكشّاف (زمخشری)؛ المناقب (خوارزمی حنفی)؛ و ... .

(۲) المعجم الاوسط (طبرانی): ج۶ ص ۲۱۸؛ شواهد التنزيل (حاكم حسكانی حنفی): ج ۱ ص ۲۲۴؛ الدر المنثور (سیوطی): ج۲ ص ۲۹۳.

چہارم: حدیث منزلت: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف مقامات اور خاص طور پر غزوہ تبوک میں جانے سے پہلے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا: **أنت منّي بمنزلة هارون من موسى الا أنه لا نبيّ بعدي** ''تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جو ھارون کو موسیٰ سے تھی، مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں''(۱)؛ جبکہ قرآنِ مجید کی نص کے مطابق حضرت ھارونؑ، نبوت کے عہدہ کے علاوہ حضرت موسیٰؑ کی وزارت اور خلافت کے عہدہ پر بھی فائز تھے۔

نیز بعض اہل سنت علماء نے مذکورہ حدیث کے ذیل میں لفظ ''**خليفتي**'' ذکر کرتے ہوئے اسی روایت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: **أنّ النبيّ قال: أما ترضى أن تكون منّي بمنزلة هارون من موسى الا أنه ليس بعدي نبي، انه لاينبغي أن أذهب الا وأنت خليفتي** ''نبی اکرمؐ نے فرمایا: کیا تم راضی نہیں ہو کہ تمہاری مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی مگر یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، میرے لیے مناسب نہیں کہ میں تمہیں اپنا خلیفہ بنائے بغیر رخصت ہو جاؤں''(۲)۔

---

(۱) صحیح (بخاری)، کتاب فضائل الصحابه، باب مناقب علي ابن ابی طالب؛ صحیح (مسلم)، کتاب فضائل الصحابه، باب من فضائل علی؛ السنن (ترمذی)، ابواب المناقب، باب مناقب علي بن أبی طالب. المستدرک (حاکم)، تفسیر سوره توبه؛ السنن الکبری (بیهقی)، باب الامام یغزی من اهل دار من المسلمین؛ السنن الکبری، (نسائی)، کتاب المناقب، باب فضائل علیؑ.

(۲) مجمع الزوائد (هیثمی): ج۹ ص۱۲۰ باب مناقب علی، النظر الیه؛ مسند (أحمد بن حنبل): ج۱ ص۳۳۱، باب مسند عبدالله بن العباس...؛ خصائص امیر المومنین (نسائی): ص۶۴؛ معجم کبیر (طبرانی): ج۱۲ ص۷۸، باب عمرو بن میمون عن بن عباس؛ الاصابه (ابن حجر): ج۳ ص۴۶۷، باب علی بن أبی طالب؛ کنز العمال (متقی هندی): ج۱۱ ص۶۰۲ فصل فی فضائل الصحابه، فضائل علیؑ.

پنجم: حدیث خاصف النعل: ایک دن حضرت علیؑ، پیغمبر اکرم ﷺ کی نعلین سی رہے تھے کہ حضرت ابوبکر اور عمر آپؐ کے پاس آئے اور عرض کی: یارسول اللہ ﷺ آپ کے بعد کس کی طرف رجوع کریں اور آپ کا جانشین کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا: میں جانتا ہوں کہ وہ کون ہے لیکن اگر تمہیں بتا دوں تو تم سب اُس سے اس طرح دور ہو جاؤ گے جیسے بنی اسرائیل، ھارونؑ سے دور ہو گئے۔ یہ سن کر دونوں (جناب ابوبکر اور جناب عمر) خاموشی سے واپس چلے گئے۔

جناب عایشہ پردے کے پیچھے یہ گفتگو سن رہی تھی، انہوں نے پیغمبر اکرم ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کی: یارسول اللہ ﷺ، وہ کون ہے جو آپ کا خلیفہ و جانشین ہوگا؟ آپؐ نے حضرت علیؑ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''وہ جوتا سینے والا ہے''(۱)۔

---

(۱) شرح نهج البلاغه (ابن ابی الحدید): ج ۲ ص ۷۸؛ أعلام النساء، ج ۲ ص ۷۸۹.

سوال نمبر 4:

کیا حضرت علی علیہ السلام نے خلفاء ثلاثہ کی بیعت کی تھی؟

بعض اہل سنت، خلفاء ثلاثہ کی خلافت کے اثبات اور تائید کے لیے یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے جناب ابوبکر، عمر اور عثمان کی حکومت کو قبول کرتے ہوئے ان کی بیعت کر لی تھی، پس شیعہ حضرات خلفاء ثلاثہ کی خلافت و امامت کو قبول کیوں نہیں کرتے؟

اول: یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے خلفاء کی بیعت کی تھی کیونکہ اہل سنت کی معتبر کتب صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں واضح طور پر موجود ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے فورا بعد جب سقیفہ میں کچھ لوگوں نے جناب ابوبکر کو خلیفہ چن لیا تو اُس وقت حضرت علیؑ نے جناب ابوبکر کی بیعت نہیں کی تھی اور اس کے بعد بھی چھ ماہ (حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی وفات کے بعد) تک لوگوں کے منتخب خلیفہ کی بیعت نہیں کی تھی(۱)۔

البتہ بعض مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کی شہادت کے بعد حضرت علیؑ سے

---

(۱) فأبى ابوبكر أن يدفع الى فاطمة منها شيئًافوجدت فاطمةُ على أبي بكر في ذلك فهجرته فلم تكلّمه حتى توفيت وعاشت بعد النبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ستّة أشهر .... ولم يكن يبايع (عليٌّ) تلك الأشهر... ''جناب ابوبکر نے فدک میں سے حضرت فاطمہؑ کو ذرا سا حصہ دینے سے بھی انکار کر دیا اس پر حضرت فاطمہ جناب ابوبکر سے ناراض ہو گئیں اور آخری وقت تک اس سے کلام نہ کیا، اور آپؑ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔۔۔۔اس مدت میں حضرت علیؑ نے بیعت نہیں کی تھی'' (صحيح بخاری: ج۵ ص۸۳، كتاب المغازي، باب غزوه خيبر؛ صحيح مسلم: ج۵ ص۱۵۴، كتاب الجهاد والسير، باب قول النبيؐ لا نورث...).

زبردستی بیعت لی گئی اور پھر یہ مشہور کر دیا گیا کہ حضرت علیؑ نے خلیفہ کی بیعت کر لی ہے(۱)؛ اُس وقت حضرت علیؑ نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مبارک کی طرف دیکھ کر اس آیت مبارکہ تلاوت کی جو حضرت ہارونؑ کی مظلومیت سے حکایت کرتی ہے (۲)۔

چنانچہ معروف مؤرخ ابن قتیبہ نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے: **فأخرجوا علياً فمضوا به الى أبي بكر، فقالوا له: بايع، فقال: إن أنا لم أفعل فمه؟! قالوا: إذا والله الذي لا إله إلا هو نضرب عنقك، فقال: إذا تقتلون عبد الله وأخا رسوله، قال عمر: أما عبدالله فنعم، أما أخو رسوله فلا، وأبو بكر ساكت لا يتكلم** ''وہ لوگ حضرت علیؑ کو گھر سے نکال کر جناب ابوبکر کے پاس لے گئے اور پھر حضرت علیؑ سے کہا: بیعت کرو، آپؑ نے فرمایا: اگر میں بیعت نہ کروں تو کیا کرو گے؟! انہوں نے کہا: اُس خدائے واحد کی قسم ہم تمہیں قتل کر دیں گے، فرمایا: اس طرح تم خدا کے بندے اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھائی کے قاتل ٹھہرو گے، جناب عمر نے کہا: خدا کے بندے کے ضرور مگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھائی کے نہیں، اُسوقت جناب ابوبکر بالکل خاموش تھے'' (۳)۔

حضرت علیؑ نے نہج البلاغہ میں حاکمِ شام کے ایک خط کے جواب میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ

---

(۱) چنانچہ بعض مؤرخین نے ذکر کیا ہے: **فقالوا له: مدَّ يدك فبايع، فأبى عليهم فمدّوا يده كرهاً فقبض على أنامله فراموا بأجمعهم فتحها فلم يقدروا، فمسح عليها أبوبكر وهي مضمومة** (نقل از اثبات الوصية (مسعودی): ص ۱۴۶، الشافي: ج۳ ص ۲۴۴)

(۲) ﴿قَالَ ابْنَ أُمَّ إِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُونِي وَكَادُوا يَقْتُلُونَنِي﴾ ''ہارونؑ نے کہا: بھائی، قوم نے مجھے کمزور بنا دیا تھا اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیتے''؛ سورہ اعراف (۷) آیت ۱۵۰؛ (**الامامة والسياسة (ابن قتيبة): ج ۱ ص ۳۰، ۳۱، باب كيف كانت بيعة علي**)

(۳) **الامامة والسياسة (ابن قتيبة): ج ۱ ص ۳۰، ۳۱، باب كيف كانت بيعة علي.**

کرتے ہوئے لکھا: **اني كنت أقاد كما يقاد الجمل المخشوش حتى أبايع** ''مجھے اس طرح کھینچا جارہا تھا جس طرح اونٹ کو نکیل ڈال کر کھینچا جاتا ہے تا کہ مجھ سے بیعت لی جائے''(۱)۔

ان روایات کے پیش نظر نہایت یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؑ نے خلفاء کی بیعت نہیں کی تھی، اور اگر آپؑ جناب ابوبکر کی بیعت کرنے پر راضی ہوتے اور خلفاء کی خلافت کو برحق سمجھتے تو صحیح بخاری اور مسلم کے مطابق چھ ماہ تک جناب ابوبکر کی بیعت سے انکار کیوں کرتے رہے؟!

اسی لئے شیخ مفیدؒ نے فرمایا: **قد أجمعت الأمّة على أنّ أمير المؤمنين عليه السلام تأخّر عن بيعة أبي بكر... والمحققّون من أهل الإمامة يقولون: لم يبايع ساعة قطّ** ''پوری امت اسلام کا اس بات پر اجماع ہے کہ امیر المومنین حضرت علیؑ نے جناب ابوبکر کی بیعت میں تاخیر کی تھی....اور شیعہ محققین کا نظریہ یہ ہے کہ حضرت علیؑ نے ایک لمحے کے لئے بھی بیعت نہیں کی''(۲)۔

دوم: حضرت علیؑ خلفاء کی بیعت کیسے کر سکتے تھے جبکہ اہل سنت کی معتبر کتاب صحیح مسلم کے مطابق آپؑ خلیفہ اول اور دوم کی حکومت وخلافت کو جھوٹ، گناہ، پیمان شکنی اور خیانت پر مشتمل حکومت سمجھتے تھے اور آخر عمر تک ان کا یہی نظریہ رہا؛ جیسا کہ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق جناب عمر نے حضرت علیؑ اور حضرت عباسؓ بن عبدالمطلب سے اسی بات کا اظہار کرتے ہوئے کہا: **فلمّا توفّى رسول الله، قال ابوبكر أنا ولي رسول الله، فجئتما تطلب ميراثاك من ابن أخيك و يطلب هذا ميراث امرأته عن أبيها ، فقال ابوبكر قال رسول الله: ما نورث ما تركنا صدقة، فرأيتماه كاذباً، آثماً، غادرًا، خائناً، والله يعلم انّه لصادق بارّ راشد تابع للحق ثم توفي ابوبكر وأنا ولي رسول الله ﷺ وولله أبي بكر فرأيتماني كاذباً آثماً غادراً**

---

(۱) نهج البلاغه (امام علیؑ): خط ۲۸.

(۲) الفصول المختارة (شیخ مفید): ص ۵۶.

خـائنًا ''جناب عمر نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا، عباس بن عبدالمطّلب سے کہا) جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی تو تم اپنے بھائی کے بیٹے کی میراث میں سے اپنا حصہ مانگنے آئے اور یہ (حضرت علی علیہ السلام) اپنی بیوی کا حصہ اس کے باپ کی جائیداد میں سے مانگنے لگے تو جناب ابوبکر نے کہا: ''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کچھ ہم (انبیاء) چھوڑتے ہیں وہ سب صدقہ ہوتا ہے، پس تم دونوں نے اسے جھوٹا، گناہ کار، دھوکے باز اور خائن سمجھا، جبکہ خدا جانتا ہے کہ وہ سچے، نیک اور حق کے پیروکار تھے، پھر جناب ابوبکر وفات پا گئے اور میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکر کا جانشین بنا اور تم دونوں نے مجھے بھی جھوٹا، گناہ کار، دھوکے باز اور خائن سمجھا'' (۱)۔

پس صحیح مسلم کی اس روایت اور جناب عمر بن خطاب کے قول کے پیشِ نظر، حضرت علی علیہ السلام جنہیں جھوٹا، گناہ کار، دھوکے باز اور خائن سمجھتے رہے اُن کی بیعت کیسے کر سکتے تھے؟!

البتہ صحیح مسلم کی مذکورہ حدیث کے بارے میں ایک قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اہل سنت کے امام بخاری نے اسی حدیث کو صحیح بخاری میں چار سے زیادہ مقام پر ذکر کیا ہے لیکن لفظ (کـاذبـاً آثـمـاً، غـادرًا خـائنـاً) جھوٹا، گنہگار، دھوکہ باز اور خائن کو حذف کر کے اس کی جگہ روایت کی عبارت بدل دی ہے تا کہ خلیفہ اول اور دوم کی حکومت کے بارے میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام کا منفی نظریہ معلوم نہ ہو سکے؟ چنانچہ انہوں نے مذکورہ روایت کی عبارت کو بدلتے ہوئے کسی جگہ لکھا: تـزعـمـان أنّ ابـابـکـر کـذا و کـذا (۲) ''تم دونوں (یعنی حضرت علیؑ اور حضرت عباس بن

---

(۱) صحیح مسلم: ج۵ ص ۱۵۲، کتاب الجهاد، باب حکم الفي.

(۲) صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب حبس نفقة الرجل...، کتاب الاعتصام، باب مایکره من التعمق والتنازع...

عبدالمطّلب) خیال کرتے ہو کہ ابوبکر ایسے ویسے تھے''؛ اور کہیں یہ عبارت لکھ دی: ثمّ جئتماني و كلّمتكما واحدة... ''پھر تم دونوں (یعنی حضرت علیؑ اور حضرت عباس) میرے پاس آئے اور ایک ہی بات کی''(۱)۔

سوم: حضرت علیؑ کا مختلف مواقع پر، خلفاء ثلاثہ کی خلافت کے خلاف احتجاج کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپؑ نے خلفاء کی بیعت نہیں کی تھی۔

چنانچہ اہل سنت کی معتبر کتاب تاریخ طبری کے مطابق حضرت علیؑ نے زبردستی یا مصلحت پر مبنی بیعت سے پہلے جناب ابوبکر کو اپنے پاس بلایا اور بنی ھاشم کے مجمع میں اُنہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''ہمارا عقیدہ ہے کہ خلافت صرف ہمارا حق ہے اور تم نے ہم پر ظلم وستم کیا ہے''(۲)۔

اسی طرح حضرت علی علیہ السلام نے حضرت عثمان کے انتخاب کے موقع پر بھی سابقہ خلفاء پر ان الفاظ کے ساتھ اعتراض کیا: بايع الناس أبابكر وأنا والله أولى بالأمر منه وأحق به منه... ''لوگوں نے ابوبکر کی بیعت کر لی جبکہ خدا کی قسم میں خلافت کیلئے بہتر اور اس کا زیادہ حق رکھتا تھا...''(۳)۔

چہارم: جناب عمر کی وفات کے بعد شوری کے دن حضرت علیؑ کا سابقہ خلفاء کی سیرت پر عمل کرنے کی شرط رَدّ کرنا بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپؑ نے خلفاء ثلاثہ کی خلافت کو کبھی بھی

---

(۱) صحيح بخاری، كتاب الفرائض باب قول النبی لانورث ماتركناه صدقة.

(۲) كنّا نرى أن لنا في هذا الأمر حقّاً فاستبددتم به علينا (تاريخ طبری: ج۲ ص۴۴۸، ۱۱ھجری کے حالات).

(۳) كنز العمال (متقی هندی) ج۵ ص۷۲۴، ح۱۴۲۴۳؛ تاريخ مدينة دمشق (ابن عساكر): ج۴۲ ص۴۳۴؛ ميزان الاعتدال (ذهبی): ج۱ ص۴۴۲؛ المناقب (خوارزمی) ص۳۱۳.

قبول نہیں کیا تھا(۱)، بلکہ صرف دین کی مصلحت کے پیش نظر خاموشی اختیار کر لی تھی اور دین ہی کی مصلحت کے تحت بعض اوقات خلفاء کی مدد اور حکومتی امور میں ان کی راہنمائی بھی کرتے رہے۔

پنجم: بعض معتبر اہل سنت مؤرخین نے بیان کیا ہے: **أتى عمر بن الخطاب منزل علي وفيه طلحة والزبير ورجال من المهاجرين فقال والله لأحرقنّ عليكم أو لتخرجنّ الى البيعة** (۲) ''عمر بن خطاب حضرت علیؑ کے گھر (کے دروازہ پر) آئے جبکہ طلحہ، زبیر اور کچھ مہاجرین بھی تھے، جناب عمر نے کہا: خدا کی قسم میں تمہارا گھر جلا دوں گا یا تم بیعت کرنے کیلئے باہر نکل آؤ''؛

اس روایت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ نے خلفاء کی بیعت نہیں کی تھی اسی لیے جناب عمر نے آپؑ کا گھر جلانے کی دھمکی دی تھی۔

---

(۱) مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ جب خلیفہ دوم زخمی حالت میں موت کے بستر پر تھے تو اُن سے اپنے بعد خلیفہ معین کرنے کا تقاضا کیا گیا تو خلیفہ دوم نے چھ فرد پر مشتمل کمیٹی (شوری) کو متعارف کروایا جس میں حضرت علیؑ، جناب عثمان، عبدالرحمٰن بن عوف، سعد بن أبي وقاص، زبیر بن عوام اور طلحہ بن عبیداللہ شامل تھے، اور حکم صادر کیا کہ یہ چھ لوگ اپنے درمیان میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لیں، خلیفہ دوم کی وفات کے بعد طلحہ بن عبیداللہ کے علاوہ باقی پانچ لوگ جمع ہوئے، زبیر بن عوام نے حضرت علیؑ کو انتخاب کیا اور سعد بن أبي وقاص نے اپنا ووٹ عبدالرحمٰن کے حوالے کر دیا جو خود خلافت سے دستبردار ہونے کا اعلان کر چکا تھا، اب خلافت کے صرف دو امیدوار تھے اور ان میں سے کسی ایک کا انتخاب عبدالرحمٰن کے ہاتھ تھا، عبدالرحمٰن نے لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد حضرت علیؑ کو بلایا اور کہا کہ میں اس شرط پر آپ کی بیعت کرتا ہوں: ''آپ اللہ تعالی کے سامنے عہد کریں کہ اللہ کی کتاب، رسول خدا ﷺ کی سنت اور پہلے دو خلفاء کی سیرت پر عمل کریں گے''؛ حضرت علیؑ نے جواب دیا: **بل على كتاب الله وسنّة رسوله واجتهاد رأيي** ''بلکہ میں اللہ کی کتاب، رسول خدا ﷺ کی سنت اور اپنے اجتہاد کے مطابق عمل کروں گا''؛ عبدالرحمٰن نے تین مرتبہ اپنی شرط دہرائی لیکن حضرت علیؑ نے ہر مرتبہ اپنا وہی جواب دہرایا اور خلفاء کی سیرت کے مطابق عمل کرنے کی شرط کو قبول نہ کیا؛ پھر عبدالرحمٰن نے جناب عثمان کو بلایا اور تین مرتبہ وہی شرط دہرائی تو جناب عثمان نے تینوں مرتبہ اس شرط کو بلا چون و چرا قبول کر لیا، پھر عبدالرحمٰن نے جناب عثمان کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور انہیں خلیفہ قرار دے دیا (رجوع کریں: شرح نہج البلاغہ (ابن ابی الحدید): ج۱ص۱۸۸؛ تاریخ طبری: ج۴ص۲۳۰ تا۲۳۴؛ تاریخ کامل (ابن اثیر): ج۳ص۶۸ تا۷۱؛ اور دیگر تاریخی کتب)۔

(۲) **تاريخ الامم والملوک (طبری)**: ج۲ ص۲۳۳، طبع بیروت، سنہ ۱۱ہجری کے حالات۔

سوال نمبر 5:

اہل بیت علیہم السلام سے مراد کون ہیں نیز کیا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج بھی آیت تطہیر میں شامل ہیں؟

آیت تطہیر کی وضاحت: آیت تطہیر، سورہ احزاب کی آیت نمبر ۳۳ کا ایک جز ہے جس میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوتِكُنَّ وَلا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الجَاهِلِيَّةِ الاولٰى وَاَقِمْنَ الصَّلوٰةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ البَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ ''اور تم اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور پہلی جاہلیت کے زمانہ کا بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو اور نماز قائم کرتی رہو اور زکوۃ دیتی رہو اور اللہ تعالی اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو، اے اہل بیت یقیناً اللہ تعالی تو صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ تم سے ہر قسم کی ناپاکی کو دور رکھے اور تمہیں ایسا پاک رکھے جیسا پاک رکھنے کا حق ہے''۔

مذکورہ آیتِ مبارکہ کے پہلے حصہ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج سے خطاب ہے جبکہ دوسرا حصہ ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُم...﴾ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام سے متعلق ہے اور اسی حصہ کو آیت تطہیر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، یہ آیت مبارکہ اگرچہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کے خطاب کے ساتھ متصل ہے لیکن مفسرین کے مطابق یہ جدا طور پر امّ سلمہؓ کے گھر اُسوقت نازل ہوئی کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پنجتن پاک علیہم السلام کو چادر تلے جمع کیا(۱)، اور فرمایا:

---

(۱) صحیح (مسلم) کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل اهل بيت النبیؐ.

اللهم هؤُلاء أهل بيتي ''اے معبود یہ میرے اہل بیت ہیں''۔

بہت سے اہل سنت معتبر علماء نے اپنی کتب میں حضرت امّ سلمہؓ سے نقل کیا ہے کہ: ایک مرتبہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت فاطمہ علیہا السلام کے گھر میں تھے اور آپ علیہا السلام سے فرمایا: علی اور اپنے دونوں بیٹوں کو بلاؤ، پھر آپؐ نے سب کو خیبری چادر کے نیچے جمع کیا اور فرمایا: **اللهم هؤلاء أهل بيتي وخاصتي فاذهب عنهم الرجس وطهّرهم تطهيرا**؛ حضرت امّ سلمہؓ فرماتی ہیں: میں آگے بڑھی اور کہا: اے خدا کے رسولؐ، کیا میں بھی آپؐ کے ساتھ ہو جاؤں؟ (اور چادر اٹھا کر اندر داخل ہونا چاہا) تو آپؐ نے ہاتھ پکڑ کر روک دیا اور فرمایا: **اِنّک علی خیر** ''تم خیر پر ہو''(۱) (اور مجھے چادر تلے داخل ہونے کی اجازت نہ دی)۔

نیز اہل سنت کے معتبر عالم دین آلوسی نے بھی تفسیر روح المعانی میں اہل سنت کے معتبر علماء ومفسرین مثلا **ترمذی، حاکم، ابن جریر، ابن منذر، ابن مردویه اور بیهقی** سے بھی اسی طرح کی روایات نقل کی ہیں کہ آیت **تطهیر** حضرت فاطمہؑ، حضرت علیؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی شان میں نازل ہوئی ہے(۲)۔

آیت کے وحدتِ سیاق کی دلیل اور اسکا جواب:

اگر کوئی مسلمان یہ دلیل پیش کرے کہ: آیت تطہیر سے پہلے ازواجِ رسولؐ سے خطاب ہے لہذا وحدتِ سیاق کو مدّنظر رکھتے ہوئے ماننا پڑے گا کہ وہ بھی اہل بیت میں شامل ہیں، تو اس دلیل

---

(۱) الفصول المهمة(ابن صباغ): ص۲۰۵، طبع النعمان؛ أسباب النزول: ص۲۹۹؛ السنن (ترمذی): ج۵ ص۳۱؛ سورہ احزاب کی تفسیر کے ذیل میں؛ مسند(احمدبن حنبل): ج۶ ص۳۲۳، حديث بعض ازواج النبيؐ؛ تفسير الدر المنثور(سيوطی): ج۵ ص۱۹۸؛ تاريخ مدينة دمشق (ابن عساكر): ج۱۳ ص۲۰۳.

(۲) روح المعاني(آلوسی): ج۲۲ ص۱۴، چاپ دار احياء التراث العربی.

کا جواب یہ ہے:

اول: اہل سنت کی بعض کتب کے مطابق ام المومنین حضرت امّ سلمہ علیہا السلام جیسی عظیم خاتون یہ بیان کرتی ہیں کہ جب میں نے چادر تلے داخل ہونے کی خواہش کی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **اِنّک علی خیر، اِنّک من أزواج النبي** ''تم خیر پر ہو، تم نبیؐ کی بیویوں میں سے ہو (نہ کہ اہل بیت علیہم السلام میں سے)۔ اور مجھے اہل بیت علیہم السلام میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی گئی، پس اہل سنت کے قول کو مانا جائے یا کہ ام المومنین کے فرمان کو؟!

دوم: آیت کا نظم وسیاق اُسوقت حجت ہے کہ جب بعد والا جملہ، پہلے جملہ سے لفظی یا معنوی لحاظ سے مختلف یا متضاد نہ ہو جبکہ آیت **تطھیر** لفظی لحاظ سے بھی پہلے حصہ سے مختلف ہے، اور معنوی لحاظ سے بھی۔

لفظی لحاظ سے اختلاف اس طرح ہے کہ آیت کے شروع میں جمع مؤنث کی ضمائر (**وقرن، کُنّ، تبرّجن، أقمن، اٰتین، أطعن**) استعمال ہوئی ہیں جبکہ آیت تطھیر میں جمع مذکر کی ضمیر (**عنکم**) اور کلمہ (**اھل البیت**) استعمال ہوا ہے۔

اور معنوی لحاظ سے اسطرح کہ صدرِ آیت جس میں ازواج رسولؐ سے خطاب ہے، عتاب وتہدید پر مشتمل ہے جبکہ آیت کا ذیل (جس میں اہل بیت علیہم السلام سے خطاب ہے)، لطف واکرام پر مشتمل ہے۔

لہذا اس آیت مبارکہ کے صدر اور ذیل میں اختلاف وتضاد سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آیت کے دونوں حصوں میں ازواج رسولؐ سے خطاب نہیں ہے۔

سوم: بہت سے اہل سنت مفسرین نے آیت تطھیر ﴿**اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ...**﴾ کا شان نزول علیحدہ بیان کیا ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آیت کا یہ حصہ جدا طور پر نازل ہوا ہے پس آیت

کے سیاق کو دلیل بناتے ہوئے رسول اکرمؐ کی ازواج کو اہل بیت میں شامل کرنا صحیح نہیں ہے(۱)۔

چہارم: شیعہ عالم دین علامہ شوشتری نے اپنی کتاب احقاق الحق میں اہل سنت کی احادیث کے ستر سے زیادہ مآخذ ومصادر ذکر کیے ہیں کہ جن کے مطابق آیت تطہیر میں اہل بیت سے مراد صرف پنجتن پاک ہیں جیسا کہ اہل سنت کے بزرگ عالم حسکانی نے اپنی کتاب **شواهد التنزيل** میں اس بارے میں ایک سو تیس احادیث جمع کی ہیں(۲)۔

پنجم: اہل سنت کی بعض معتبر کتب میں انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آیت تطہیر کے نزول کے بعد چھ ماہ تک جب صبح کے وقت فجر کی نماز ادا کرنے کے لئے مسجد کی طرف جاتے تو حضرت فاطمہؑ کے گھر کے دروازہ سے گزرتے ہوئے فرماتے: اے اہل بیتؑ نماز کا وقت ہو چکا ہے، پھر آیت تطہیر کی تلاوت فرماتے(۳)؛ یقیناً پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اس عمل کے ذریعہ امت پر واضح کرنا چاہتے تھے کہ اہل بیتؑ صرف حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کا گھرانہ ہے۔

ششم: اہل سنت کے نظریہ کے مطابق کیا جناب عایشہ بھی آیت تطہیر میں شامل ہوسکتی ہیں جنہوں نے اپنے زمانے کے امام اور حاکم (حضرت علیؑ) کے خلاف قیام کیا، جنگ جمل لڑی جسکے نتیجہ میں ستر ہزار سے زیادہ مسلمان قتل ہوئے(۴)، اور بعد میں ان کو اپنے اس فعل پر پشیمانی بھی ہوئی؟! کیا آیت تطہیر کے مصداق سے اتنی بڑی غلطی سرزد ہوسکتی ہے کہ اس کی وجہ سے ستر ہ

---

(۱) تفسیر جامع البیان(طبری)، ذیل آیت تطهیر.

(۲)رجوع کریں: شواهد التنزيل (حاكم حسكاني): طبع اول ۱۴۱۱، مجمع احياء الثقافة الاسلامية.

(۳) كان النبي صلى الله عليه وسلم يمرّ ببيت فاطمة ستّة أشهر إذا خرج إلى الفجر، فيقول الصلاة يا أهل البيت انّما يريد الله ليذهب عنكم الرجس أهل البيت ويطهركم تطهيرا (مسند احمد (احمد بن حنبل): ج۳ص ۲۵۹) (۴) تاریخ طبری اوردیگر تاریخی کتب.

ہزار سے زیادہ مسلمانوں کا خون رائیگاں چلا جائے؟!

ہفتم: اہل بیت میں ازواج رسولؐ شامل نہیں ہوسکتیں اس لیے کہ اللہ تعالی نے رسول اکرمؐ کی بیویوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿یَانِسَاءَ النَّبِیِّ مَنْ یَأْتِ مِنْکُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُبَیِّنَةٍ یُضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ﴾(۱) ''اے رسول کی بیویو! تم میں سے جو کوئی کھلی بدکاری کرے گی اس کو دہرا عذاب ملے گا'' پس اللہ تعالی جن کی طہارت کا اعلان کر چکا ہو اُن کے بارے میں عذاب کی وعید مناسب نہیں ہے لہذا اگر اللہ تعالی نے پیغمبر اکرم ﷺ کی ازواج کو پاک و پاکیزہ رکھنے کا ارادہ کیا ہوتا تو ان کو اس طرح کے عذاب سے نہ ڈرایا جاتا؛ لہذا مذکورہ آیت مبارکہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے جن کو پاک و پاکیزہ رکھنا چاہا وہ اور لوگ ہیں اور جنہیں بدکاری سے روکنے کے لیے دہرے عذاب کی خبر دی، وہ اور خواتین ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالی نے پیغمبر اکرمؐ کی ازواج میں سے دو بیبیوں کے بارے میں واضح طور پر ارشاد فرمایا: ﴿فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُکُمَا﴾(۲) ''تم دونوں بیبیوں کے دل ٹیڑھے ہو چکے ہیں'' اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ دل کے ٹیڑھے پن سے مراد، انسان کا گمراہ ہونا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے ہرگز رسولؐ کی بیویوں کو پاک و پاکیزہ نہیں رکھنا چاہا اور نہ ہی اُن سے برائی کو دور کیا ہے اور اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالی کبھی بھی آپؐ کی بعض ازواج کے دلوں کی کجی اور انحراف کا اعلان نہ کرتا۔

صحیح بخاری اور دیگر اہل سنت مفسرین کے مطابق اس آیت میں رسول خدا ﷺ کی جن دو بیبیوں کا ذکر ہوا ہے وہ جناب عائشہ اور جناب حفصہ ہیں؛ جیسا کہ روایت میں ہے کہ حضرت

---

(۱) سورہ احزاب (۳۳): آیت ۳۰.

(۲) سورہ تحریم (۶۶): آیت ۴.

ابن عباس فرماتے ہیں: میری یہ خواہش تھی کہ جناب عمر سے دریافت کروں کہ اس آیت میں کونسی دو بیبیوں کے دلوں کی کجی کا اعلان ہوا ہے؟ پھر ایک سفر کے دوران جب ابن عباس نے جناب عمر سے یہی سوال کیا تو جناب عمر نے کہا: **واعجبا لک یاابن عباس هما عائشة و حفصة** ''اے ابن عباس تم پر تعجب ہے کہ تمہیں بھی معلوم نہیں، وہ دونوں عائشہ اور حفصہ ہیں''(۱)۔

ہشتم: اہل سنت کی معتبر کتاب صحیح مسلم میں مسلم بن حجاج حدیث ثقلین نقل کرنے کے بعد یوں بیان کرتے ہیں: یزید بن حیان نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معروف صحابی زید بن ارقم سے سوال کیا: پیغمبرؐ کے اہل بیت کون شخصیات ہیں؟ کیا آپؐ کی ازواج بھی اہل بیت میں شامل ہیں؟

زید بن ارقم نے جواب میں کہا: **لا و أیم الله أنّ المرأة تکون مع الرجل العصر من الدهر ثم یطلقها فترجع الی أبیها وقومها، أهل بیته أصله وعصبته الذین حرموا الصدقة بعده** ''نہیں (ایسا نہیں ہے) خدا کی قسم، عورت ایک مدت تک مرد کے ساتھ رہتی ہے پھر ممکن ہے کہ مرد اُسے طلاق دے دے تو وہ اپنے باپ اور قوم کی طرف چلی جاتی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت سے مراد وہ ہستیاں ہیں جو اُن کی اصل (یعنی قرابت کی گہری جڑیں رکھنے والی) اور ان کے وہ وابستگان ہیں کہ جن پر وصالِ رسولؐ کے بعد بھی صدقہ حرام ہے''(۲)۔

پس مذکورہ قطعی دلائل کے باوجود اگر کوئی مسلمان ازواج رسولؐ کے اہل بیت میں شامل ہونے پر اصرار کرے تو یقیناً یہ لجاجت وہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے اور یا اہل بیت علیہم السلام سے بغض وعناد کا اثر، کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج کا اہل بیت میں شامل ہونا نہ قرآن مجید سے ثابت ہے اور نہ ہی روایات واحادیث سے۔

---

(۱) تفسیر الدر المنثور (جلال الدین سیوطی) ج۶ ص ۲۴۲، ط اول ۱۳۶۵، الفتح جده.

(۲) صحیح (مسلم) ج۶، کتاب فضائل الصحابه، باب فضائل علی بن ابی طالب.

سوال نمبر 6:

حضرت علی علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کے نام خلفاء کے ناموں پر کیوں رکھے؟

تاریخی حقائق کے مطابق حضرت علی علیہ السلام نے اپنے بیٹوں کے نام، عمر اور عثمان رکھے جیسا کہ آپؑ نے اپنے ایک بیٹے کا نام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر ''محمد'' بھی رکھا، لہذا بعض اہل سنت یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت علیؑ کا اپنے بیٹوں کیلئے خلفاء کے ناموں کا انتخاب اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علیؑ کی نظر میں خلفاء کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا وگرنہ وہ اپنے بیٹوں کے نام، اُن کے ناموں پر نہ رکھتے؟ ایسے افراد کی اس غلط فہمی کا جواب چند مختلف جہتوں سے دیا جا سکتا ہے۔

اول: ناموں اور اسماء کی اچھائی یا برائی، نام کے معنی کی بنا پر ہوتی ہے جیسے ''علیؑ'' یعنی ''بلندی والا'' اور ''ابوجہل'' یعنی ''جہالت کا باپ''(۱)؛ اور یا کسی اسم کی اچھائی یا برائی، مسمّی کی اچھی شہرت یا برے کردار کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے ''حسینؑ'' یعنی ''باعزت و عظمت شخصیت'' اور ''یزید'' یعنی ''ملعون و منفور فرد''۔

اسی طرح ناموں کی ایک قسم اور بھی ہے اور وہ یہ کہ کوئی ''نام''، نہ تو معنی کے لحاظ سے اچھا یا برا ہوتا ہے اور نہ ہی مسمّی کے لحاظ سے، بلکہ وہ نام صرف اسم عَلَم (نام) کے طور پر کسی فرد کی شناخت کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اس سے کوئی خاص معنی مراد نہیں لیا جاتا، تاریخ میں مذکور اکثر افراد کے نام اسی قسم کے ہیں مثلاً زید، کمیل وغیرہ؛ پس ایسے نام جو صرف اسم عَلَم کے طور پر استعمال ہوں

---

(۱) یہاں لفظ معاویہ کی بھی مثال دی جا سکتی ہے جو لغت میں ''الکلبة المستحرمة'' کے معنی میں ہے، تفصیل کیلئے عربی لغات مثلاً معجم مقاییس اللغة، تاج العروس یا القاموس کی طرف رجوع کریں۔

اوران سے کوئی خاص معنی مراد نہ لیا جائے وہ نام ذاتی طور پر نہ برے ہوتے ہیں اور نہ ہی اچھے بلکہ اس قسم کے ناموں کی برائی یا اچھائی اور مومنین کی ان سے نفرت یا محبت صرف اس لئے ممکن ہے کہ یہ نام ایک طویل عرصہ تک کسی خاص فرد کی پہچان رہے ہیں، لہذا لفظ ''عمر'' یا ''عثمان'' میں معنی اور نام کے لحاظ سے کوئی برائی نہیں پائی جاتی بلکہ یہ نام صرف اسم عَلَم کے طور پر استعمال ہوتے ہیں، اس بنا پر یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ حضرت علیؑ کی اولاد میں سے بعض کے لیے یہ نام کیوں انتخاب کیے گئے؛ اسی طرح یہ اعتراض بھی صحیح نہیں ہے کہ جب حضرت علیؑ کی اولاد کیلئے یہ نام استعمال ہوئے ہیں تو آج کے مومنین اپنی اولاد کے لیے یہ نام انتخاب کیوں نہیں کرتے؟، کیونکہ امیر المومنینؑ کی اولاد کیلئے یہ نام اسوقت انتخاب ہوئے جب یہ نام خلفاء کے ساتھ خاص نہیں ہوئے تھے، اور نہ ہی عام لوگ اس نام و مسمّی سے متنفر تھے، اور نہ ہی ان ناموں سے فوری طور پر خلفاء کا تصور ذہن میں آتا تھا۔

دوم: یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اُس زمانے میں جناب عمر، ابوبکر یا عثمان جیسے نام صرف خلفاء ثلاثہ کے ناموں کی بناء پر تھے جبکہ خلفاء ثلاثہ کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے اصحاب اور عام افراد کے بھی یہی نام تھے؟! مثلاً اُمّ المومنین حضرت امّ سلمہؓ کے حقیقی بیٹے اور پیغمبر اکرم ﷺ کے سوتیلے بیٹے کا نام ''عمر بن ابوسلمہ قرشی'' تھا(۱)، اسی طرح حضرت امّ سلمہؓ کے سابقہ شوہر کا نام ''عمر بن ابی سفیان بن عبدالاسد'' تھا، اسی طرح ابن حجر نے ۲۰ سے زائد صحابہ کا ذکر کیا ہے جن کا نام عمر تھا مثلاً: **عمر بن الحکم السلمی؛ عمر بن الحکم البهزی؛ عمر بن سعد وغیرہ**(۱)۔

---

(۱) یہ کہنا بھی ممکن ہے کہ شاید حضرت علیؑ نے اپنے بیٹے کا نام رسول خدا ﷺ کے سوتیلے بیٹے کے نام پر عمر رکھا ہو، جسے رسول خدا ﷺ بھی اپنا بیٹا کہا کرتے تھے۔

(۲) رجوع کریں: **الاصابة في تمييز الصحابة(ابن حجر عسقلانی): باب ذكر من اسمه عمر.**

بلکہ اہل سنت کی بعض کتب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نام (عمر) بہت قدیمی ہے جیسا کہ ابوالفتوح رازی نے ﴿وَإِذْ نَجَّيْنَاكُمْ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ...﴾(۱) کی تفسیر کے ذیل میں فرعون کا نسب بیان کرتے ہوئے لکھا: **ولید ... بن ثروان بن عمر بن قاران بن عملان بن لاوذبن سام بن نوحؑ** (۲)، اس سے واضح ہوتا ہے کہ عمر بہت قدیمی نام ہے اور خلیفہ دوم کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اسی طرح ابن حجر نے چھبیس (۲۶) اصحاب کا ذکر کیا ہے جن کا نام عثمان تھا مثلا: **عثمان بن ابوجهم الأسلمي؛ عثمان بن حكيم؛ عثمان بن حميد ؛ عثمان بن حنيف؛ عثمان بن ربيعة؛ عثمان بن مظعون؛ عثمان بن معاذ؛** وغیرہ(۳)؛ تو کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب نام خلفا کے ناموں کی بنا پر رکھے گئے تھے، اگر ایسا کہنا درست نہیں ہے تو پھر یہ دعوی کیسے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنے بیٹوں کے نام خلفاء کے نام پر رکھے تھے؟!!!

سوم: اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ شیعہ اور اہل سنت مسلمان یزید بن معاویہ اور اسکے پلید کردار سے متنفر ہیں لیکن اس کے باوجود بہت سے موثق راویوں اور آئمہ معصومینؑ کے اصحاب میں بہت سے ایسے افراد ہیں جن کا نام یزید تھا مثلا: **یزید بن حاتم، یزید بن عبدالملک، یزید بن صائغ، یزید بن خلیل، یزید مولی حکم** وغیرہ؛ تو کیا ان ناموں کو یزید بن معاویہ سے محبت کی دلیل بنایا جا سکتا ہے؟!!! یا آج اگر کوئی اپنے بیٹے کا نام غلام احمد رکھے تو کیا اُسے نبوت کے جھوٹے دعویدار غلام احمد قادیانی سے محبت کی دلیل بنایا جا سکتا ہے؟!! کیا خلفاء کی

---

(۱) سورہ بقرة (۲): آیت ۴۹.

(۲) تفسیر ابوالفتوح رازی: ج ۱ ص ۲۶۹، تفسیر سورہ بقرة.

(۳) رجوع کریں: **الاصابة في تمييز الصحابة**(ابن حجر عسقلانی): **باب ذكر من اسمه عثمان**، اسی طرح "**اسد الغابة في معرفة الصحابة**" میں بھی ایسے بہت سے افراد کا ذکر موجود ہے جن کا نام عمر یا عثمان تھا۔

فضیلت ثابت کرنے کے لیے ایسی بے بنیاد اور خود ساختہ باتوں سے استدلال ایک طرح کی کمزوری شمار نہیں ہوتی ؟!!! جبکہ یہ بات واضح ہے کہ کسی بھی معاشرے میں لوگوں کے نام اُس معاشرے کی ثقافت سے وابستہ ہیں اور خلفاء کے نام عرب کے متداول ناموں میں سے تھے۔

چہارم: بعض علماء کے بقول حضرت امام حسنؑ کے ایک بیٹے کا نام ''عَمرو'' تھا(۱)، تو کیا کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ امام حسنؑ نے یہ نام عمرو بن عبدود یا عمرو بن ھشام (ابوجہل) کے نام پر رکھا تھا، جبکہ یہ دونوں بھی عرب کے مشہور افراد میں سے تھے۔

پنجم: بعض مؤرخین نے انکشاف کیا ہے کہ جناب عمر نے (اپنا سیاسی اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے) حضرت علیؑ کے ایک بیٹے کا نام اپنے نام پر رکھا تھا، جیسا کہ بلاذری نے بیان کیا ہے: **وكان عمر بن الخطاب سمى عمر بن علي باسمه** ''عمر بن خطاب نے عمر بن علیؑ کا نام اپنے نام پر رکھا''(۲)؛ اسی طرح ذھبی نے بیان کیا ہے: **عمر بن علي بن أبي طالب ... ومولده في أيام عمر، فعمر سمّاه باسمه** ''عمر بن علی کی ولادت عمر (بن خطاب) کے دورِ خلافت میں ہوئی اور جناب عمر نے اُس کا نام اپنے نام پر رکھا(۳)؛ اس بنا پر یہ دعوی کیسے صحیح ہوسکتا ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنے بیٹے کا نام خلیفہ ثانی کے نام پر رکھا تھا؟!!!

نیز بعض مؤرخین نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ خلیفہ دوم لوگوں کے نام بدل دیا کرتے تھے(۴)؛ لہذا

---

(۱) الارشاد (شیخ مفید): ج۲ ص۲۰، باب ذکر ولد الحسن علیه السلام.

(۲) انساب الاشراف (أحمد بن یحی بلاذری): ص۱۹۲، ولد علي بن أب طالب.

(۳) سیر اعلام النبلاء (ذهبی): ج۴ ص۱۳۴، طبع نهم ۱۴۱۳ھ، ناشر مؤسسة الرسالة بیروت.

(۴) ابن حجر نے بیان کیا ہے: **عبدالرحمن بن الحارث ... كان أبوه سماه ابراهيم فغيّر عمر اسمه** ''عبدالرحمٰن بن حارث.... اُس کے باپ نے اُس کا نام ابراہیم رکھا تھا لیکن عمر نے اُس کا نام بدل دیا'' (الاصابة (ابن حجر): ج۵ ص۲۳)

یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے حضرت علی علیہ السلام کے بیٹے کا نام بھی بدل کر اپنے نام پر رکھ دیا ہو۔

ششم: حضرت علیؑ نے اپنے ایک بیٹے کا نام عثمان رکھا، لیکن روایات کے مطابق آپؑ نے اپنے اس بیٹے کا نام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی عثمان بن مظعون (۱) کے نام پر رکھا تھا، نہ کہ خلیفہ ثالث عثمان بن عفان کے نام پر؛ چنانچہ امیر المومنینؑ نے فرمایا: **انما سمّیته باسم أخی عثمان بن مظعون** ''میں نے اس (بیٹے) کا نام اپنے بھائی عثمان بن مظعون کے نام پر رکھا ہے (۲)۔

ہفتم: اگر حضرت علی علیہ السلام کی نظر میں واقعا خلفاء ثلاثہ کا مقام و مرتبہ ہوتا اور وہ اس قابل ہوتے کہ امیر المومنین علیہ السلام اپنے بیٹوں کے نام اُن کے ناموں پر رکھیں تو تاریخی لحاظ سے بھی حضرت علیؑ اور خلفاء ثلاثہ کے باہمی روابط اچھے ہونا چاہیے تھے جبکہ اہل سنت کی معتبر کتب کے مطابق جناب عمر بن خطاب کے بقول، حضرت علی علیہ السلام، خلیفہ اول اور دوم کو جھوٹا، گناہ کار، دھوکے باز اور خائن سمجھتے تھے (۳)؛ ایسی صورت میں حضرت علیؑ اپنے بیٹوں کے نام کسی ایسے فرد کے نام پر کیسے رکھ سکتے ہیں

---

(۱) عثمان بن مظعون پیغمبر اکرمؐ کے بچپن اور جوانی کے ساتھی اور نہایت باوفا صحابی ہیں جنہوں نے حضورؐ کے ساتھ تجارت کیلئے بحرین کا سفر کیا اسوقت عثمان بن مظعون آپؐ کے ساتھ تھے، مدینہ میں جنت البقیع میں دفن ہونے والے پہلے مسلمان بھی آپ ہی ہیں، جب پیغمبر اکرمؐ کے آٹھ یا گیارہ مہینے کے بیٹے ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپؐ نے اسے جنت البقیع میں عثمان بن مظعون کی قبر کے پاس دفن کیا اور فرمایا: میں نے تجھے اس کے پاس دفن کیا ہے کہ جو خدا کے ولیوں میں سے ایک ولی ہے، حضرت علیؑ نے اپنے ایک بیٹے کا نام عثمان بن مظعون کے نام پر رکھا۔

(۲) مقاتل الطالبین (أبو الفرج الاصفهانی): ص ۵۵؛ بعض معتبر اہل سنت علماء نے ابو الفرج اصفہانی کو صدوق شمار کرتے ہوئے اپنی کتب میں انکے اقوال سے استدلال کیا ہے، چنانچہ ابن حجر اور ذھبی اُنکے بارے میں کہتے ہیں: علی بن الحسین أبو الفرج الأصبهانی الأموی صاحب کتاب الأغانی ... والظاهر أنه صدوق (لسان المیزان (ابن حجر عسقلانی): ج۴ص ۲۲۱، ط بیروت؛ میزان الاعتدال (ذهبی): ج۳ص ۱۲۳، ط دار المعرفة)

(۳) اس بارے میں سوال نمبر 4 کے جواب کے ضمن میں روایت کا ذکر گزر چکا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

جوآپؑ کی نظر میں جھوٹا، گناہ کار، دھوکے باز اور خائن ہو؟!

اسی طرح صحیح بخاری کی روایت کے مطابق امیر المومنین حضرت علیؑ خلیفہ اول کو آمر و خود سر تصور کرتے تھے: **ولکنّک استبددت علینا بالامر و کنّا نری لقرابتنا من رسول الله** ﷺ **نصیبا**ً ''لیکن تم زبردستی ہم پر مسلط ہو گئے جبکہ ہم رسول خداﷺ کے ساتھ اپنی قرابت کی بنا پر خود کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے''(۱)۔

صحیح بخاری کی اسی روایت کے ابتدائی جملات سے یہ بھی استفادہ ہوتا ہے کہ حضرت علیؑ کو جناب عمر بن خطاب کا سامنا کرنا بھی گوارا نہیں تھا چنانچہ روایت میں ہے: **فأرسل إلی أبی بکر أن ائتنا و لا یأتنا أحدٌ معک کراهیةً لمحضرِ عمر** ''حضرت علیؑ نے جناب ابوبکر کو پیغام بھیجا کہ وہ تنہا آئیں، کیونکہ آپؑ کو جناب عمر کے روبرو ہونا گوارا نہیں تھا''(۲)۔

جب اہل سنت کی صحیح بخاری جیسی معتبر کتاب کے مطابق حضرت علیؑ کا جناب ابوبکر اور جناب عمر کے بارے میں ایسا نظریہ تھا تو پھر ایسی صورت میں آپؑ اپنے کسی بیٹے کا نام اُن کے نام پر کیسے رکھ سکتے ہیں؟!!

ہشتم: اگر حضرت علی علیہ السلام کے بیٹوں کے نام، ابوبکر، عمر اور عثمان ہونے کو حضرت علیؑ کے خلفاء کے ساتھ اچھے تعلقات اور محبت کی دستاویز قرار دیا جا سکتا ہے تو کیا ان خلفاء کا اپنے کسی بیٹے کا نام بھی علی یا حسن یا حسین نہ رکھنے کو اُن کے عدم تعلق اور فقدان محبت کی واضح دلیل قرار نہیں دیا جا سکتا؟!

---

(۱) صحیح بخاری: ج۵ ص ۳۹، کتاب المغازی، باب غزوہ خیبر.

(۲) حوالہ سابق

سوال نمبر 7:

کیا خلیفہ اول اور دوم کا پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ دفن ہونا، اللہ تعالی کی رضایت کی دلیل ہے؟

سب مسلمان جانتے ہیں کہ خلیفہ اول اور دوم کی قبر، پیغمبر اکرم ﷺ کی قبر مبارک کے ساتھ ہے، تو کیا اُن کا آپؐ کے قریب دفن ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ اللہ تعالی اُن کے ساتھ راضی ہے؟! چونکہ وہ اپنی زندگی میں بھی حبیب خدا ﷺ کے ساتھ رہے اور موت کے بعد بھی اللہ تعالی نے ان کو اپنے حبیب کے ساتھ مقام عطا فرمایا لہذا اللہ تعالی اُن کے ساتھ راضی ہے(۱)۔

اس غلط فہمی کا جواب چند مختلف پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے۔

اول: اگر کسی کا رسول خدا ﷺ کے پہلو میں دفن ہونا اللہ تعالی کی رضایت کی دلیل ہے تو پھر یہ کہنا بھی صحیح ہوگا کہ خانہ کعبہ میں بتوں کی موجودگی بھی اللہ تعالی کی رضایت کی دلیل تھی جبکہ کوئی مسلمان اس بات کو قبول نہیں کر سکتا۔

دوم: اس بات کی طرف توجہ ضروری ہے کہ رسول خدا ﷺ کے حجرہ میں جناب ابوبکر اور جناب عمر کا دفن ہونا فقہی اعتبار سے ہرگز قابلِ توجیہ نہیں ہے، کیونکہ وہ حجرہ یا تو رسول خدا ﷺ کی ذاتی

---

(۱) اس بارے میں ابن عساکر نے روایت کی ہے کہ جب جناب ابوبکر کا جنازہ پیغمبر اکرمؐ کے حجرہ کے سامنے رکھا گیا تو دروازہ خود بخود کھل گیا اور یہ آواز آئی: **ادخلوا الحبیب الی الحبیب، فانّ الحبیب الی الحبیب مشتاق**؛ لیکن ابن حجر نے اس روایت کو باطل اور جھوٹ قرار دیا ہے اور خود ابن عساکر نے بھی اس روایت کے بعض راویوں کو کذاب اور مجہول قرار دیا ہے (رجوع کریں: **لسان المیزان (ابن حجر)**: ج۳ ص ۳۹۱)۔

ملکیت میں تھا(۱)، یا امت اسلام کے لیے صدقہ تھا(۲)۔

پس اگر وہ حجرہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت میں تھا تو وہاں کسی کو دفن کرنے کے لیے آپؐ کے وارثوں (یعنی سیدہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی اولاد) سے اجازت لینا ضروری تھا۔

اور اگر آپؐ کا حجرہ امت اسلام کے لیے صدقہ کی حیثیت رکھتا تھا تو وہاں کسی کو دفن کرنے کے لیے پوری امت اسلام کی اجازت اور رضایت شرط تھی جبکہ خلیفہ اول اور ثانی کے دفن کے لیے نہ تو اہل بیت سے اجازت لی گئی اور نہ ہی تمام مسلمانوں کی اجازت و رضایت ثابت ہے۔

اور اگر کہا جائے کہ جناب ابوبکر اپنی بیٹی عائشہ اور جناب عمر اپنی بیٹی حفصہ کے حق کی بنا پر وہاں دفن کیے گئے تو اس کا جواب تین طرح سے دیا جا سکتا ہے:

۱: جب جناب ابوبکر کی روایت کے مطابق رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ترکہ امت کے لیے صدقہ ہے تو پھر جناب عائشہ کا آپؐ کے حجرے پر کوئی اختیار نہیں رہتا اور انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہاں کسی کے دفن کی اجازت دیں۔

۲: اگر جناب عائشہ کی نظر میں جناب ابوبکر سے منقول روایت (۳) صحیح نہیں تھی اور وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ترکہ کو ورثہ سمجھتی تھیں اور یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ بیویاں زمین سے بھی ارث حاصل کرتی ہیں (جبکہ فقہ کے مطابق غیر منقول جائیداد سے بیویاں حصہ نہیں لے سکتیں) پھر بھی جناب عائشہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حجرہ کے آٹھویں حصہ میں سے نویں حصہ کی حقدار بنتی ہیں کیونکہ جس وقت

---

(۱) یہی قول حق ہے کیونکہ انبیاء کی ذاتی میراث بھی ان کے وارثوں کو ورثہ میں ملتی ہیں، اور یہی نظریہ قرآن مجید کی صریح آیات اور دیگر بہت سی روایات و احادیث سے ثابت ہے۔

(۲) یہ نظریہ حدیث نحن معاشر الانبیاء لانورث ماترکناہ صدقۃ کی بنا پر ہے، اگرچہ یہ قرآن سے متضاد ہے۔

(۳) یعنی حدیث: نحن معاشر الانبیاء لانورث ماترکناہ صدقۃ؛ یہی حدیث فدک کے سلسلہ میں حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے دعوی کی ردّ میں دستاویز قرار دی گئی تھی۔

پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت ہوئی اس وقت آپ کی ایک بیٹی اور نو بیویاں تھیں اور قرآن مجید کی آیت مبارکہ ﴿فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُم﴾(۱) کے مطابق اگر میت کی اولاد ہو تو بیویوں کا حصہ کل ترکہ کا آٹھواں حصہ ہوتا ہے۔

چونکہ رسول خدا ﷺ کی بیٹی حضرت فاطمۃ علیہا السلام موجود تھیں لہذا آپؐ کے ترکہ کا صرف آٹھواں حصہ آپؐ کی ازواج کا ہے اور چونکہ کل نو (۹) بیبیاں تھیں لہذا اُسی آٹھویں حصہ کو نو بیویوں پر تقسیم کیا جائے گا اور اس طرح رسول خدا ﷺ کے حجرہ کے آٹھویں حصہ میں سے نواں حصہ جناب عایشہ کی ملکیت اور ان کے اختیار میں ہوسکتا ہے اس بنا پر رسول خدا ﷺ کے حجرہ میں سے ہر بیوی کا حصہ شاید ایک یا دو بالشت سے زیادہ نہیں ہے؛ نیز جناب عائشہ سمیت رسول خدا ﷺ کی کوئی بھی زوجہ دوسری بیبیوں کی اجازت کے بغیر اپنے اُس مختصر حصہ میں بھی تصرف کرنے کا حق نہیں رکھتی تھیں کیونکہ اُن کا حصہ مشاع (مشترک) تھا۔

۳: چونکہ رسول خدا ﷺ کی ازواج کو آپؐ کے بعد شادی کرنے کا حق نہیں ہے، اس لحاظ سے وہ عدت والی عورتوں کی طرح ہیں جن کو اپنے شوہروں کے گھروں میں صرف رہنے کا حق حاصل ہوتا ہے جسے حق منفعت کہا جاتا ہے، اور حق منفعت کو میراث میں نہیں لیا جاتا، لہذا جناب عایشہ، حفصہ اور دوسری ازواج کو بھی عدت والی عورتوں کی طرح پیغمبر اکرم ﷺ کے حجرہ میں صرف رہنے کا حق حاصل تھا لیکن آپؐ کے ترکہ میں مالکانہ تصرف (مثلا بیچنے یا کسی کو بخش دینے) کا حق نہیں رکھتی تھیں۔

لہذا یہ کہنا غلط ہے کہ اللہ تعالی نے جناب ابوبکر اور جناب عمر کو موت کے بعد اپنے حبیب کے ساتھ مقام عطا فرمایا، کیونکہ یہ جناب عائشہ اور جناب حفصہ کا کام تھا کہ انہوں نے

---

(۱) ''اور اگر تمہاری کوئی اولاد ہو تو تمہارے ترکہ میں سے تمہاری بیبیوں کا آٹھواں حصہ ہے'' (سورہ نسا (۴): آیت ۱۲).

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر اور حضرت فاطمہ علیہا السلام کی وراثت میں تصرف کرتے ہوئے خلیفہ اول اور دوم کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں دفن کیا(۱)۔

سوم: اس سلسلہ میں فضال بن حسن اور اہل سنت کے امام ابوحنیفہ کا ایک دلچسپ مناظرہ پیش کرتے ہیں جسے بعض علماء نے نقل کیا ہے: فضّال بن حسن کوفی آل محمد علیہم السلام کے شیعوں میں سے تھے، ایک دن امام ابوحنیفہ اپنے مریدوں کے جھرمٹ میں بیٹھے ان پر اپنا علمی رعب و دبدبہ ظاہر کر رہے تھے کہ ادھر سے فضال کا گزر ہوا، جب انہوں نے جناب ابوحنیفہ کو مریدوں کے ہجوم میں دیکھا تو ان کے پاس گئے اور سب کو سلام کیا، تمام لوگوں نے سلام کا جواب دیا۔

فضال نے کہا: اے ابوحنیفہ! میرا بھائی یہ کہتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے بہترین فرد، علی بن ابی طالب ہیں جبکہ میں کہتا ہوں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے بہترین فرد، جناب ابوبکر ہیں اور انکے بعد جناب عمر؛ آپ کی نظر کیا ہے؟

امام ابوحنیفہ نے کچھ دیر سر جھکا کر فکر کی اور پھر کہا: جناب ابوبکر اور عمر کے لیے یہی فخر و منزلت کافی ہے کہ وہ دونوں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب (دفن) ہیں، کیا تم نہیں جانتے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کو اپنے ساتھ قبر کی جگہ دی، پس اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟!

فضال نے کہا: میں نے یہی بات اپنے بھائی سے بھی کہی لیکن وہ نہیں مانا اور کہا: اگر یہ کہو کہ، جناب ابوبکر اور عمر کے دفن کی جگہ ان کی اپنی ملکیت تھی تو یہ جھوٹ ہے اور اگر وہ جگہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت تھی تو وہ دونوں اس جگہ ناحق دفن ہوئے ہیں۔

---

(۱) جناب عائشہ کے حکم پر، جوانان جنّت کے سردار (امام حسن مجتبیٰ) کے جنازے کو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مبارک کے پاس لانے سے روک دیا گیا، جبکہ انہی کی اجازت سے خلیفہ اول اور ثانی کو آپؐ کی قبر کے پاس دفن کیا گیا (سیر اعلام النبلاء (ذهبی): ج۲ ص ۲۰۵؛ الطبقات الکبری (ابن سعد): ج۳ ص ۱۴۸).

جناب ابوحنیفہ نے کچھ دیر فکر کی اور پھر کہا: وہ جگہ جناب ابوبکر اور عمر کی ملکیت نہ تھی بلکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت تھی جو جناب عائشہ اور حفصہ کو ورثہ میں ملی اور ان دونوں نے خلیفہ اول اور دوم کے دفن کی اجازت دی۔

فضال نے کہا: میں نے یہی بات اپنے بھائی سے بھی کہی تھی لیکن اس نے کہا: ہر مسلمان جانتا ہے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہوئی تو آپؐ کی نو (9) بیویاں تھیں، اور شریعت کے مطابق رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملکیت میں سے تمام بیویوں کا آٹھواں (1/8) حصہ بنتا ہے اور آپؐ کی کل ملکیت کے آٹھویں حصّے کو، اگر نو (۹) بیویوں پر تقسیم کریں تو ہر ایک کا حصہ ایک بالشت زمین سے زیادہ نہیں بنتا، اس بنا پر جناب عائشہ اور جناب حفصہ رسول اکرمؐ کے ترکہ میں سے صرف ایک ایک بالشت زمین کی مالک تھیں پھر ایک بالشت زمین میں ایک آدمی کیسے دفن ہوسکتا ہے؟!۔

نیز یہ کیسے ممکن ہے کہ جناب عائشہ اور حفصہ تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائیداد کی وارث بنیں لیکن پیغمبرؐ کی بیٹی حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا اپنے باپ کی جائیداد کی وارث نہ بنیں؟!

امام ابوحنیفہ نے فورا کہا: اسے یہاں سے دور لے جاؤ، یہ رافضی ہے۔

اس واقعہ کو پیش نظر رکھنے کے بعد کوئی صاحبِ فہم وفراست یہ نظریہ کیسے قبول کرسکتا ہے کہ جناب ابوبکر اور جناب عمر کو اللہ تعالی نے اپنے رسولؐ کے پاس جگہ دی ہے؟!!! کیونکہ یہ جناب عائشہ اور جناب حفصہ کا ذاتی عمل تھا جسے کبھی بھی اللہ تعالی کا فعل قرار نہیں دیا جاسکتا۔

سوال نمبر 8:

کیا خلیفہ دوم نے حضرت علیؑ کی بیٹی جناب ام کلثوم سے شادی کی تھی؟

جواب: آج کل ہمارے مسلمان معاشرے میں یہ بات رائج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ خلیفہ دوم نے حضرت علی علیہ السلام کی بیٹی جناب ام کلثوم سے شادی کی تھی لیکن اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جناب عمر بن خطاب سے حضرت علی علیہ السلام کی کسی بیٹی کی شادی محض ایک افسانہ ہے، ذیل میں اس حوالے سے چند اہم نکات پیش کرتے ہیں۔

اول: کسی روایت کی صحت وسقم یا کسی تاریخی واقعہ کی حقیقت جاننے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کے مندرجات کو نظر غائر سے دیکھا جائے کہ جو کچھ اس میں مذکور ہے وہ ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ اہل سنت مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ یہ شادی ۱۷ھ میں انجام پائی(۱)؛ اور چونکہ ام کلثوم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے آخری سال میں پیدا ہوئیں لہذا شادی کے وقت وہ صرف سات سال(۲) کی

---

(۱) چنانچہ یعقوبی لکھتے ہیں: وخرج عمر الی مکة سنة ۱۷ ... وفي هذه السنة خطب عمر الی علي بن أبی طالب أم كلثوم بنت علي ... (تاریخ یعقوبی: ج۲ص۱۴۹، ایام عمر بن الخطاب)

(۲) ابن سعد نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے: تزوّجها عمر بن الخطاب وهي جارية لم تبلغ ''عمر نے ام کلثوم سے اسوقت شادی کی جب ام کلثوم ابھی بالغ بھی نہیں ہوئیں تھی''؛ اور دوسری روایت میں نقل کیا: لمّا خطب عمر بن الخطاب الی علي ابنته أم كلثوم، قال يا أمير المومنين انّها صبية ''جب عمر بن خطاب نے حضرت علیؑ سے آپؑ کی بیٹی ام کلثوم کا رشتہ مانگا تو حضرت علیؑ نے فرمایا: اے امیر المومنین وہ تو ابھی بچی ہے'' (الطبقات الکبری (محمد بن سعد): ج۸ص۴۶۳، ۴۶۴، باب أم كلثوم بنت علي)

ہوئیں؛ جبکہ جناب عمر بن خطاب ۶۳ سال کی عمر میں قتل ہوئے، یعنی ۱۷ھ میں حضرت ام کلثوم صرف سات سال کی نابالغ بچی تھی جبکہ جناب عمر بن خطاب ۵۷ سال کے تھے؛ اس نکتہ کے پیش نظر حضرت ام کلثوم اور جناب عمر بن خطاب کی شادی کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں سے سوال ہے کہ آخر کیا وجہ تھی کہ ایک نابالغ بچی کی شادی ۵۷ سال کے بوڑھے آدمی سے کردی گئی؟!!!(۱)۔

اگر کہا جائے کہ جناب عمر بن خطاب کو یہ شوق تھا کہ ان کا خاندان رسولؐ سے انتساب ہو جائے، تو اس کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ اگر یہ شوق سچا تھا تو انتساب تو پہلے ہی سے ہو چکا تھا کیونکہ جناب عمر کی بیٹی رسولؐ کی زوجہ تھیں لہذا وہ رسولؐ کے خسر ہو گئے پس اگر یہ مصاہرت کچھ فائدہ دے سکتی ہے تو کافی تھی اور پھر کسی خاندان سے نسبت کا فائدہ تب ہوتا ہے جب اس خاندان کی شرافت وعظمت کوئی تسلیم کرتا ہو جبکہ جناب عمر ہی وہ بزرگوار ہیں کہ جن کی کوششوں سے رسول

---

(۱) اور پھر جالب یہ ہے کہ بعض اہل سنت مؤرخین اور علماء کے مطابق جناب عمر خود بھی جوان لڑکیوں کی عمر رسیدہ مردوں کے ساتھ شادی کے مخالف تھے، چنانچہ ابن عساکر نے ذکر کیا ہے: أتى عمر بن الخطاب بامرأة شابة زوجوها شيخا كبيرا فقتلته، فقال: أيها الناس، اتقوا الله، ولينكح الرجل لمته من النساء، ولتنكح المرأة لمتها من الرجال يعنى شبهها ''عمر بن خطاب کے پاس ایک جوان لڑکی کو لائے جس کی شادی ایک عمر رسیدہ مرد سے کی گئی تھی اور اُس نے اپنے شوہر کو قتل کر دیا تھا، جناب عمر نے کہا: اے لوگو! اللہ سے ڈرو، ہر مرد کو چاہیے کہ وہ عورتوں میں سے اپنی ہم کفو سے شادی کرے اور ہر عورت کو چاہیے کہ وہ مردوں میں سے اپنے ہم کفو سے شادی کرے'' (كنز العمال (متقى هندى): ج ۱۶ ص ۴۹۹؛ تاريخ المدينة: ج ۲ ص ۷۶۹؛ اسی طرح کی روایت شرح نهج البلاغة (ابن ابى الحديد): ج ۱۲ ص ۱۶۳ میں بھی نقل ہوئی ہے)؛ اس بنا پر ام کلثوم اور جناب عمر کی شادی ثابت کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں مارنے والوں سے سوال ہے کہ کیا جناب عمر کا یہ فعل قرآن مجید کی اس آیت کا مصداق نہیں ہے جس میں اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنسَوْنَ أَنفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتَابَ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾ ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو جب کہ کتاب خدا کی تلاوت بھی کرتے ہو، کیا تمہارے پاس عقل نہیں ہے''؟!!! (سورہ بقرہ: آیت ۴۴)۔

خدا ﷺ کی رحلت کے بعد، خاندان رسالت ظاہری خلافت وحکومت سے محروم ہوگیا، انہوں نے جناب سیدہ فاطمۃ علیہا السلام کے دروازہ پر لکڑیاں جمع کر کے آگ لگانے کی دھمکی دی(۱)، اور پھر دروازہ جلادیا، انہی کی وجہ سے حضرت فاطمہؑ کو اپنے والد بزرگوار کی میراث سے محروم کردیا گیا اور فدک کی جاگیر چھین لی گئی، پس جس صاحب کے کردار سے حضرت فاطمہؑ اس دنیا سے روتی ہوئی چلی گئی (۲)،

---

(۱) جیسا کہ ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶) نے اپنی کتاب الامامة والسياسة (معروف بہ تاریخ الخلفاء) میں "كيف كانت بيعة علي بن أبي طالب كرم الله وجهه" کے عنوان سے، عبداللہ بن عبدالرحمٰن انصاری سے روایت کی ہے: "ان أبابكر رضي الله عنه تفقد قوما تخلّفوا عن بيعته عند علي كرم الله وجهه، فبعث اليهم عمر، فدعا بالحطب وقال: والذي نفسي بيده لتخرجن أو لأحرقنها على من فيها، فقيل له: يا اباحفص، انّ فيها فاطمة؟ فقال: و اِنْ،..." ابوبکر نے اپنی بیعت سے انکار کرنے والوں کا سراغ لگایا کہ وہ حضرت علیؑ کے پاس جمع تھے، پھر عمر کو ان کے پاس بھیجا، لیکن وہ گھر سے باہر نہ نکلے، پھر عمر نے آگ لگانے کے لیے لکڑیاں لانے کا حکم دیا، اور پھر گھر میں موجود افراد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اُس کی قسم جس کے قبضہ میں عمر کی جان ہے، گھر سے باہر آجاؤ وگرنہ گھر والوں سمیت آگ لگادوں گا، ایک شخص نے عمر سے کہا: اے اباحفص: کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس گھر میں فاطمۃ علیہا السلام ہے؟! عمر نے کہا: اگرچہ فاطمۃ علیہا السلام بھی ہو! (الامامة والسياسة (ابن قتيبة): ج ۱ ص ۱۹)؛ اسی طرح اہل سنت کے معتبر عالم بلاذری نے لکھا ہے: ان ابابكر ارسل الى علي يريد البيعة، فلم يبايع، فجاء عمر ومعه فتيلة فتلقته فاطمة على الباب، فقالت فاطمة: يابن خطاب! أتراك محرقا عليَّ بابي؟! قال: نعم؛ "ابوبکر نے حضرت علیؑ کی طرف پیغام بھیجا کہ وہ بیعت کریں لیکن انہوں نے بیعت کرنے سے انکار کردیا، پھر عمر ایک مشعل اٹھائے ہوئے حضرت علیؑ کے گھر کی طرف گئے، حضرت فاطمہ نے گھر کے دروازہ پر ہی عمر کو دیکھا اور کہا: اے ابن خطاب: کیا تم مجھ پر میرا جلتا ہوا دروازہ دیکھو گے؟! عمر نے کہا: ہاں۔ (انساب الاشراف (بلاذری): ج ۱ ص ۵۸۶)۔

(۲) ابن قتیبہ نے ذکر کیا ہے کہ حضرت فاطمہؑ نے جناب ابوبکر اور عمر سے کہا: "...فاني اشهد الله وملائكته أنكما أسخطتماني وما أرضيتماني، ولئن لقيت النبي لاشكونكما اليه ..." "میں خدا اور ملائکہ کو گواہ بناتی ہوں کہ تم نے مجھے ناراض کیا ہے، اور مجھے راضی نہیں کیا، اور جب میں پیغمبرؐ سے ملاقات کروں گی تو تم دونوں کی شکایت کروں گی" (الامامۃ والسیاسۃ (ابن قتیبۃ): ج ۱ ص ۳۰)

اور حضرت علیؑ نے انہیں سیدہ فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے جنازہ میں شرکت کی اجازت بھی نہ دی، پھر اسی عمر بن خطاب کو اُسی علیؑ و فاطمہؑ کی اولاد سے شرف حاصل کرنے کا شوق کیسے پیدا ہو گیا؟؟!

دوم: جناب عمر سے حضرت علی علیہ السلام کی بیٹی امّ کلثوم کی شادی کا ذکر نہ تو صحیح بخاری میں ہے اور نہ ہی صحیح مسلم میں، نیز اہل سنت کی معتبر ترین کتب صحاح ستّہ میں سے کسی ایک کتاب میں بھی اس کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے، جس سے اس بات کو تقویت ملتی ہے کہ یہ واقعہ صرف ایک افسانہ ہے؛ نیز اس شادی کے سلسلہ میں جو روایات نقل ہوئی ہیں ان میں متن اور مضمون کے لحاظ سے بہت زیادہ تضاد پایا جاتا ہے جو ان روایتوں کو معتبر ہونے سے ساقط اور ان کے ضعیف ہونے پر دلالت کرتا ہے، اور روایتوں کے اس تضاد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ خاص مقاصد کے پیش نظر گھڑا گیا ہے۔

سوم: قرآن مجید کا ارشاد ہے: ﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ ''یقیناً تمہارے لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں بہترین نمونہ عمل ہے''(۱)؛ اور دوسری طرف اہل سنت کی معتبر تاریخی کتب اس بات کی گواہ ہیں کہ جناب ابوبکر اور جناب عمر بن خطاب دونوں باری باری، حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے ساتھ شادی کی درخواست لیکر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے لیکن آپؐ نے دونوں کی درخواست ٹھکرا دی(۲)؛ پس جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِن دونوں حضرت کو اپنی بیٹی

---

(۱) سورہ احزاب (۳۳) آیت: ۲۱

(۲) أن أبا بكر خطب فاطمة إلى النبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال: يا أبا بكر انتظر بها القضاء، فذكر ذلك أبو بكر لعمر فقال له عمر: ردّك يا أبا بكر، ثم إن أبا بكر قال لعمر: اخطب فاطمة إلى النبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، فخطبها فقال له مثل ما قال لابي بكر، انتظر بها القضاء، فجاء عمر إلى أبي بكر فأخبره فقال له: ردّك يا عمر (الطبقات الكبرى (ابن سعد): ج۸ص ۱۹)؛ خطب أبوبكر وعمر فاطمة الى رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فأبى رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عليهما (كنز العمال (متقى هندى): ج۱۳ ص ۱۱۴؛ أسد الغابة (ابن اثير): ج۵ص ۵۲۰)؛ أنّ أبابكر خطبها فأعرض عنه صلى الله عليه وآله، ثم عمر فأعرض عنه ... (الصواعق المحرقة(ابن حجر): ص ۱۶۳)

کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تو نفس رسول (۱) اور آپؐ کا اسوہ حسنہ اختیار کرنے والے علی بن ابی طالبؑ، اپنی بیٹی کے بارے میں جناب عمر کی ایسی درخواست کیسے قبول کر سکتے ہیں؟!!!

کیا یہ ممکن ہے کہ حضرت علیؑ رسول خداؐ کے اسوہ پر عمل کرنے سے باز رہیں اور آپؐ کی سنت کے خلاف عمل انجام دیں؟! جبکہ حضرت علیؑ نے خود فرمایا ہے: **ولقد كنت اتبعه اتباع الفصيل اثر أُمّه** ''یقیناً میں اس طرح آپؐ کی اتباع کرتا رہا جیسے اونٹنی کا بچہ اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلتا ہے'' (۲)۔

چہارم: جناب عمر سے حضرت علیؑ کی بیٹی کی شادی کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں کو دراصل امّ کلثوم کے نام سے اشتباہ ہوا ہے کیونکہ جناب عمر نے جناب ابوبکر کی بیٹی ام کلثوم سے شادی کی درخواست کی تھی کہ جسے پہلی ہی مرتبہ قبول بھی کر لیا گیا تھا، اگرچہ خود ام کلثوم جناب عمر سے شدید نفرت کرتی تھی؛ چنانچہ طبری نے بیان کیا ہے: **قال المدائنی وخطب [عمر] أم كلثوم بنت أبی بكر و هي صغيرة ، و أرسل فيها إلى عائشة ، فقالت: الامر اليک ، فقالت أم كلثوم : و لا حاجة لي فيه، فقالت لها عائشة: ترغبين عن أمير المؤمنين؟ قالت: نعم، إنه خشن العيش شديد على النساء ...** ''مدائنی نے بیان کیا ہے: عمر نے ابوبکر کی بیٹی ام کلثوم کا رشتہ مانگا جو کم سن تھی، اور عائشہ کی طرف پیغام بھیجا، عائشہ نے ام کلثوم سے کہا: تمہاری کیا مرضی ہے تو ام کلثوم نے جواب دیا: مجھے عمر کی طرف کوئی رغبت نہیں ہے، عائشہ نے کہا: کیا تم امیر المومنین کو ٹھکرا رہی ہو؟ ام کلثوم نے کہا: ہاں، کیونکہ وہ ہمیشہ غصے میں رہتا ہے، عورتوں پر سختی کرتا ہے،...'' (۳)۔

---

(۱) آیت مباہلہ کا مفہوم۔ (۲) نہج البلاغہ: خطبہ قاصعہ

(۳) تاریخ طبری: ج۳ ص ۲۷۰؛ اسی طرح ابن عساکر نے بیان کیا ہے: **عن خالد أن عمر خطب أم كلثوم بنت أبی بكر إلى عائشة** ''خالد نے بیان کیا ہے کہ جناب عمر نے جناب عائشہ سے جناب ابوبکر کی بیٹی ام کلثوم کا رشتہ مانگا (تاریخ مدینۃ دمشق: ج۲۵ ص ۹۶)

پس اس اختلاف کی حقیقت یہ ہے کہ جس ام کلثوم کے ساتھ جناب عمر نے نکاح کیا وہ جناب ابوبکر کی بیٹی تھی جو اہل سنت کی معتبر کتب تاریخ طبری، کامل ابن اثیر اور استیعاب وغیرہ کے مطابق ابوبکر کی وفات کے ایام میں پیدا ہوئی اور اُس کا نام ام کلثوم رکھا گیا۔

اور چونکہ جناب ابوبکر کی بیوی اسماء بنت عمیس نے ان کی وفات کے بعد حضرت علیؑ سے نکاح کر لیا تھا یہی وجہ ہے کہ جناب ابوبکر کے بیٹے محمد بن ابی بکر اور ان کی بیٹی ام کلثوم نے حضرت علیؑ کے ہاں پرورش پائی، جناب عمر نے اسی ام کلثوم کے ساتھ شادی کی درخواست جناب عائشہ سے کی تھی، اور عین ممکن ہے کہ جناب عمر نے جناب عائشہ کی رضایت حاصل کرنے کے بعد حضرت علیؑ سے بھی اجازت لینا ضروری سمجھا ہو کیونکہ وہ آپؑ کے زیر تربیت تھی۔

لہذا بعض مؤرخین اور محدثین اور خاص طور پر جناب عمر کو حضرت علیؑ کا داماد قرار دینے والے مسلمان غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں اور انہوں نے جناب ابوبکر کی بیٹی ام کلثوم کو حضرت علیؑ کی بیٹی سمجھا اور ایسے محدثین کی تائید کرنے لگے جنہوں نے اپنے خاص مقاصد کے تحت جناب ابوبکر کی بیٹی کا قصہ حضرت علیؑ کی بیٹی کے ساتھ منسوب کر دیا تھا۔

پنجم: اس مسئلے میں اشتباہ کا ایک اور سبب بھی ممکن ہے اور وہ یہ کہ مورخین کے مطابق جناب عمر بن خطاب نے جس ام کلثوم سے نکاح کیا تھا وہ حضرت علیؑ کی بیٹی نہیں تھی بلکہ جرول بن مالک بن مسیّب کی بیٹی تھی اور عبیداللہ بن عمر کی ماں بنی(۱) جس کا حضرت علی علیہ السلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

جیسا کہ اہل سنت کے مشہور مؤرخ طبری نے جناب عمر کی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

''وزید الاصغر وعبیداللہ قُتلا یوم صفین مع معاویة، واُمّهما: أمّ کلثوم بنت جرول بن مالک بن مسیّب'' عمر کی اولاد میں سے زید اصغر اور عبیداللہ ہیں کہ جو جنگ صفین میں

---

(۱) سیر أعلام النبلاء(ذهبی): ص ۷۸.

معاویہ کی فوج میں قتل ہوئے، ان دونوں کی ماں اُمّ کلثوم بنت جرول بن مالک بن مسیّب ہے(۱)۔

ششم: تاریخی حقائق، جناب عمر بن خطاب سے حضرت علی علیہ السلام کی کسی بیٹی کی شادی کے واقعہ کے جھوٹا ہونے کی تائید کرتے ہیں: اہل سنت میں سے سب سے پہلے جس نے اس افسانہ کو بیان کیا وہ ابن سعد (متوفی ۲۳۰ھ) ہے، اُس نے اپنی کتاب الطبقات الکبری میں یوں بیان کیا ہے:

''حضرت علی بن اَبی طالب کی بیٹی ام کلثوم ہے.... اُس کے ساتھ عمر بن خطاب نے شادی کی جبکہ وہ ابھی بالغ بھی نہیں ہوئی تھی، عمر اُس کے پاس ہی رہے یہاں تک کہ قتل کر دیئے گئے... پھر عمر کے بعد عون بن جعفر بن ابی طالب نے ام کلثوم کے ساتھ شادی کی اور پھر جب وہ فوت ہو گئے تو اُن کے بھائی محمد بن جعفر نے ام کلثوم کے ساتھ شادی کی، اور پھر جب محمد بن جعفر فوت ہو گئے تو عبداللہ بن جعفر نے حضرت زینب کے بعد ام کلثوم سے شادی کر لی''(۲)۔

اس روایت کے مطابق جناب ام کلثوم کی شادی عمر بن خطاب کے قتل ہونے کے بعد انکے چچا کے بیٹے عون بن جعفر سے ہوئی اور پھر عون کی وفات کے بعد عبداللہ بن جعفر نے ام کلثوم کے ساتھ شادی کی، جبکہ راوی اس بات کو بھول گیا تھا کہ عون بن جعفر اور عبداللہ بن جعفر دونوں بھائی

---

(۱) تاریخ الامم (طبری): ج ۳ ص ۲۶۹؛ الکامل في التاریخ(ابن اثیر): ج ۲ ص ۴۵۰؛ البدایة والنهایة (ابن کثیر): ج۷ص ۱۵۶.

(۲) ام کلثوم بنت علي بن أبی طالب ...تزوجها عمر بن الخطاب وهي جارية لم تبلغ فلم تزل عنده الی أن قتل... ثم خلف علی أم کلثوم بعد عمر عون بن جعفر بن أبي طالب بن عبدالمطلب فتوفّي عنها فخلف عليها أخوه محمد بن جعفر بن أبي طالب فتوفي عنها فخلف عليها أخوه عبدالله بن جعفر بن أبی طالب بعد أختها زينب بنت علي بن أبی طالب؛ (الطبقات الکبری (محمد بن سعد): ج۸ ص ۴۶۲).

جناب عمر ہی کے زمانے میں سنہ ۱۶ یا ۱۷ ہجری کو جنگ شوشتر (تستر) میں شہید ہو گئے تھے(۱)۔

یعنی مذکورہ روایت کے مطابق جناب ام کلثوم کا دوسرا اور تیسرا شوہر، پہلے شوہر (جناب عمر بن خطاب) کی زندگی ہی میں فوت ہو گئے تھے؛ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب عمر کے ساتھ حضرت علیؑ کی بیٹی ام کلثوم کی شادی کا قصہ بالکل غلط ہے اور اس قصے کو سب سے پہلے ذکر کرنے والے مؤرخ ابن سعد کو ''ام کلثوم'' کے نام سے اشتباہ ہوا ہے اور اُس نے غلطی سے ام کلثوم کو حضرت علیؑ کی بیٹی لکھ دیا ہے۔

ہفتم: اگر حضرت علی علیہ السلام کی بیٹی اور خلیفہ دوم کی شادی کی داستان میں کچھ حقیقت پائی جاتی تو تاریخی لحاظ سے بھی حضرت علیؑ اور خلیفہ دوم کے باہمی روابط اچھے ہونا چاہیے تھے جبکہ اہل سنت کی معتبر کتب کے مطابق جناب عمر بن خطاب نے خود ہی اقرار کیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام، اُنہیں اور خلیفہ اول کو جھوٹا، گناہ کار، دھوکے باز اور خائن سمجھتے تھے(۲)؛ اس بنا پر حضرت علیؑ کسی ایسے شخص کو اپنا داماد کیسے بنا سکتے ہیں جو آپؑ کی نظر میں ایسی منفی صفات رکھتا ہو؟!

ہشتم: جناب عمر بن خطاب کے ساتھ جناب ام کلثوم کی شادی ثابت کرنے کے لیے جو روایات نقل کی گئی ہیں اُن میں واضح طور پر ناموسِ رسولؐ کی توہین پائی جاتی ہے، کہ اگر کوئی باشعور مسلمان

---

(۱) **وقال أبو عمر استشهد عون بن جعفر في تستر وذلک في خلافة عمر** ''ابوعمر کا کہنا ہے کہ عون بن جعفر عمر کے دور میں جنگ شوشتر میں شہید ہو گئے تھے'' (**الاصابة (ابن حجر)**: ج۴ ص ۶۱۹)؛ **واستشهد عون بن جعفر وأخوه محمد بن جعفر بتستر ولا عقب له** ''عون بن جعفر اور اس کے بھائی محمد بن جعفر جنگ شوشتر میں شہید ہو گئے اور ان کی کوئی اولاد نہیں تھی'' (**الاستیعاب (ابن عبد البر)**: ج ۳).

(۲) اس بارے میں سوال نمبر 4 کے ضمن میں روایت کا ذکر گزر چکا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

ان روایات کوغور سے پڑھے تو اس کی پیشانی سے شرم حیاء کا پسینہ بہنے لگے(۱)، لہذا ایسی روایات سے جناب عمر کی فضیلت ثابت نہیں ہوتی بلکہ اُن کی توہین ہوتی ہے۔

نہم: اگرچہ بعض شیعہ کتب میں بھی اس سلسلہ میں روایات نقل ہوئی ہیں جنہیں درایت کے اصولوں کونظر انداز کرتے ہوئے تسامحاً بیان کیا گیا ہے، اور بہت سے جید شیعہ علماء نے واضح کیا

---

(۱) جیسا کہ اہل سنت کے معتبر عالم اور حافظ علی الاطلاق ابن حجر عسقلانی نے نقل کیا ہے: **عن محمد بن علي: أنّ عمر خطب إلى علي ابنته أم كلثوم، فذكر له صغرها، فقيل له: إنّه ردّك فعاوده فقال: له علي أبعث بها إليك فإن رضيت فهي امرأتك، فأرسل بها إليه، فكشف عن ساقها فقالت: مه، لولا إنّك أمير المؤمنين للطمت عينيك** ''محمد بن علی سے روایت ہے کہ جناب عمر نے حضرت علیؑ سے ان کی بیٹی کا رشتہ مانگا تو آپؑ نے اُس کی کم سنی کا ذکر کیا، کسی نے عمر سے کہا: علیؑ نے تجھے انکار کر دیا ہے لہذا دوبارہ جاؤ، تو حضرت علیؑ نے فرمایا: میں ام کلثوم کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں اگر تمہیں پسند آجائے تو اس کو اپنی بیوی بنالو، پھر حضرت علیؑ نے ام کلثوم کو جناب عمر کے پاس بھیجا، اُس نے ام کلثوم کی پنڈلی سے کپڑا ہٹایا، ام کلثوم نے کہا: مجھے چھوڑ دو، اگر تم خلیفہ نہ ہوتے تو تمہاری آنکھیں پھوڑ دیتی'' (الاصابة (ابن حجر): ج۸ص ۴۶۴)۔

ذھبی نے بھی اسی جیسی روایت نقل کی ہے اور اس بات کا اضافہ کیا ہے کہ ام کلثوم نے واپس پلٹ کر حضرت علیؑ سے کہا: **بعثتني الى شيخ سوء** ''آپ نے مجھے ایک برے بوڑھے کے پاس بھیجا تھا'' (سير اعلام النبلاء (ذهبي): ج۳ص ۵۰۱)؛ ہمارے نزدیک یہ روایات یقیناً جعلی ہیں لیکن ان روایات کی بنا پر جناب عمر کو حضرت علیؑ کا داماد قرار دینے والوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ ممکن ہے کہ حضرت علیؑ اپنی بیٹی کو ایسی شرم آور ملاقات کے لیے بھیجیں؟! اور یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمانوں کے خلیفہ نامحرم کی پنڈلیوں کو چھوئیں اور کپڑا ہٹا کر دیکھیں، یہاں تک کہ وہ کم سن لڑکی اس عمل کی برائی کو سمجھ لے لیکن خلیفۃ المسلمین متوجہ نہ ہوں؟!

کیا رسول خداﷺ کے جانشین اور مسلمانوں کے خلیفہ سے ایسا عمل سرانجام پانا ممکن ہے؟!

اگر کوئی مسلمان اپنی ناموس سے متعلق ایسا زشت عمل برداشت نہیں کرسکتا تو ناموسِ رسولؐ کے بارے میں ایسی روایات کو

قبول کیسے کیا جا سکتا ہے؟! نیز ایسی روایات کی بنا پر جناب عمر کو حضرت علیؑ کا داماد کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟!!!۔

ہے کہ ایسی نسبت بالکل غلط ہے۔

البتہ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ شیعہ کتب میں موجود ایسی روایات کی چھان بین کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ یہ روایات بھی حضرت علیؑ اور جناب عمر کے درمیان دوستانہ روابط کو ثابت نہیں کرتی، یہی وجہ ہے اہل سنت ان روایات سے استدلال نہیں کر سکتے کیونکہ کہ اگر فرضی طور پر ان روایات کو قبول بھی کر لیا جائے جب بھی اہل سنت کا مقصد (حضرت علیؑ اور جناب عمر کے درمیان قرابتداری اور اچھے روابط کا اثبات) حاصل نہیں ہوسکتا، کیونکہ ان روایات کی بنا پر یہ شادی خلیفہ دوم کے ڈرانے اور دھمکانے کی بنا پر ہوئی تھی جبکہ نہ حضرت علیؑ راضی تھے اور نہ ہی حضرت ام کلثوم؛ پس اگر کوئی مسلمان ان روایات سے استدلال کرتے ہوئے جناب عمر کو حضرت علیؑ کا داماد ثابت کرنے کی کوشش کرے تو وہ خود ہی جناب عمر کی شخصیت کو مجروح کرنے کا بھی مرتکب ہوگا۔

تو کیا اس شادی کے من گھڑے قصے کو جناب عمر کے لیے فضیلت شمار کیا جا سکتا ہے؟!!!

دہم: اگر صرف شادی ہی فکری میل جول اور اچھے روابط کی دلیل ہو تو پیغمبر اکرم ﷺ اور حضرت امّ حبیبہ کی شادی کو رسول خدا ﷺ اور ابوسفیان کے اچھے تعلقات کی دلیل تسلیم کرنا پڑے گا، کیونکہ حضرت امّ حبیبہ ابوسفیان کی بیٹی تھیں، جبکہ کوئی مسلمان پیغمبر اکرم ﷺ اور ابوسفیان کی دوستی کے نظریہ کو قبول نہیں کر سکتا۔

خلاصہ یہ کہ جناب عمر بن خطاب اور حضرت علیؑ کی بیٹی جناب ام کلثوم کی شادی کا قصہ کسی افسانہ سے بھی زیادہ بے بنیاد ہے۔

سوال نمبر 9:

حضرت علیؑ نے اپنی خلافت کے دوران فدک واپس کیوں نہ لیا؟

حضرت علی علیہ السلام اپنی خلافت کے زمانے میں فدک(۱) واپس لے سکتے تھے لیکن آپؑ نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا، تو کیا آپؑ کا فدک واپس نہ پلٹانا جناب ابوبکر کے موقف کی تصدیق نہیں ہے کہ فدک امت کا حق تھا نہ کہ اہل بیت علیہم السلام کا؟ اس سوال کے جواب کے لیے مندرجہ ذیل نکات پر توجہ دینا ضروری ہے:

اول: اہل بیت علیہم السلام کے فدک واپس نہ پلٹانے کی ایک وجہ شیخ صدوقؒ نے اپنی کتاب ''العلل'' میں

---

(۱) فدک، سعودی عرب کے شمال میں خیبر کے قریب مدینہ سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع نہایت ذرخیز زمین ہے، مؤرخین کے اقوال کے مطابق سنہ ۷ ہجری میں جنگ خیبر کی فتح کے بعد کفار کے دلوں پر خوف و ہراس طاری ہوگیا، چونکہ فدک میں رہنے والے خیبر کے بہت قریب تھے اور انہیں لشکر اسلام سے بہت زیادہ وحشت تھی چنانچہ انہوں نے فدک کی زمین کے بدلے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امان چاہی اور فدک کی زمین آپؐ کی ملکیت میں دے دی جس میں کھجور کے باغات تھے، اور چونکہ فدک کے لیے مسلمانوں نے جنگ نہیں کی تھی لہذا یہ زمین رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی ملکیت قرار پائی (فكانت خيبر فيءً للمسلمين و كانت فدک خالصة لرسول الله، لأنّهم لم يجلبوا عليها بخيل و لا ركاب (تاريخ طبری: ج ۲ ص ۳۰۳؛ سيرة ابن هشام: ج ۳ ص ۸۰).

مؤرخین کے مطابق اُس دور میں فدک کی آمدنی چالیس ہزار دینار تھی، اہل سنت کی معتبر کتب میں روایت ہے کہ جب سورہ اسراء کی آیت ۲۶ نازل ہوئی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالی کے حکم کے تحت فدک کی جاگیر حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا کو ہبہ کردی (عن أبی سعيد قال: لمّا نزلت هذه الآية: ﴿ وَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ﴾، دعا رسول الله صلى الله عليه

و سلم فاطمة فأعطاها فدک(شواهد التنزیل(حاکم حسکانی): ج ۱ ص ۴۴۱؛ (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

امام صادقؑ سے نقل کرتے ہوئے بیان کی ہے:قال: سألته لأيّ علّة ترک علي عليه السلام فدکا لمّا ولی الناس؟ قال: للاقتداء برسول الله ﷺ، لمّا فتح مکّة وقد باع عقيل بن ابی طالب داره، فقيل له: يارسول الله ألا ترجع الی دارک؟ فقال:هل ترک عقيل لنا دارا؟ انّا اهل بيت لانسترجع شيئا أخذ منّا ظلما، ولذلک لم يسترجع فدکا لمّا ولی (۱)۔''حضرت امام جعفر صادقؑ سے پوچھا: جب حضرت علیؑ کو خلافت ملی تو آپؑ نے فدک واپس کیوں نہ لیا؟ تو امامؑ نے فرمایا: رسول خدا ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے، کیونکہ جب عقیل نے آنحضرت ﷺ کا گھر بیچ دیا تو فتح مکہ کے بعد آپؐ سے کہا گیا: یارسول اللہ ﷺ کیا آپؐ اپنے گھر واپس نہ جائیں گے؟ آپؐ نے فرمایا: کیا عقیل نے ہمارے لیے کوئی گھر چھوڑا ہے؟! ہم

(بقیہ گذشتہ صفحہ سے) تفسیر القرآن العظیم (ابن کثیر): ج۳ص ۳۹؛ الدر المنثور (جلال الدین سیوطی): ج۴ص ۱۷۷)۔

صحیح بخاری میں جناب عائشہ کی روایت کے مطابق رسول خدا ﷺ کی وفات کے بعد فدک کی ملکیت پر حضرت فاطمہؑ اور جناب ابوبکر میں اختلاف پیدا ہوگیا، حضرت فاطمہؑ نے فدک پر اپنی ملکیت کا حق جتلایا جبکہ جناب ابوبکر نے جناب عمر کے مشورہ سے فدک کو حکومت کی ملکیت قرار دیا، جس پر حضرت فاطمہؑ جناب ابوبکر سے ناراض ہوگئیں اور اپنی وفات تک ان سے کلام نہیں کیا(فغضبت فاطمة بنت رسول الله ﷺ فهجرت ابابکر فلم تزل مهاجرته حتی توفیت(صحیح بخاری: کتاب بدء الخلق، باب فرض الخمس))،اہل سنت کے مطابق حضرت ابوبکر نے یہ فیصلہ ایک حدیث کی بنیاد پر دیا جس کے مطابق پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا کہ انبیاء کی وراثت نہیں ہوتی اور وہ جو کچھ چھوڑتے ہیں سب صدقہ ہوتا ہے، جبکہ اہل تشیع کے مطابق یہ فیصلہ درست نہیں تھا کیونکہ اولا: یہ حدیث حضرت ابوبکر کے علاوہ کسی نے روایت نہیں کی؛ ثانیا: قرآن مجید کی کچھ آیات میں انبیاء کی وراثت کا واضح طور سے ذکر کیا گیا ہے؛ ثالثا: اگر یہ حدیث صحیح ہوتی تو حضرت فاطمہؑ کو اس سے ضرور باخبر ہونا چاہیے تھا کیونکہ رسول خدا ﷺ کی وراثت کا مسئلہ خاص طور پر اُن سے مربوط تھا۔

(۱) علل الشرائع(شیخ صدوق): ج ۱ ص ۵۵، باب ۲۴، حدیث ۲؛ مناقب ابن شهر آشوب: ج ۱ ص ۲۳۲.

اہل بیتؑ ایسی چیز واپس نہیں لیتے جو ہم پر ظلم کر کے چھین لی گئی ہو، اسی لیے حضرت علیؑ نے خلافت سنبھالنے کے بعد بھی فدک واپس نہ لیا''۔

دوم: اسی طرح جب حضرت امام موسی کاظمؑ سے یہی سوال پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: **لانّا اهل بيت لا ياخذ لنا حقوقنا ممّن ظلمنا الّا الله تعالى، ونحن أولياء المومنين، انما نحكم لهم نأخذ حقوقهم ممن ظلمهم ولا نأخذ لأنفسنا** ؛''ہم اہل بیت ہیں، جو ہم پر ظلم کرے خدا ہی اُس سے ہمارا حق لیتا ہے، اور ہم مومنین کے ولی ہیں، جو ہمارے مومنوں پر ظلم کرے تو ہم اُن کے لئے اُن کا حق واپس لیتے ہیں لیکن خود اپنا حق واپس نہیں لیتے (جو ہم سے ظلم کے ساتھ چھین لیا گیا ہو)''(۱)۔

اس روایت کی بنا پر امام علیؑ نے اپنی ظاہری حکومت کے دوران فدک واپس پلٹانے کے حوالے سے کوئی اقدام نہ کیا تا کہ لوگوں پر واضح ہو جائے کہ حکومت علوی عوام کے حقوق کے حصول کی تلاش میں ہے، اور علیؑ نے عوام میں سے مظلوم ومحروم افراد کی مدد کے لیے خلافت کو قبول کیا ہے، نہ کہ ذاتی مفادات کے لیے۔

سوم: حضرت امام علیؑ نے اپنی ظاہری خلافت کی ابتدا اور بیعت کے موقع پر سابقہ خلافت کے دوران لوگوں کی جائیدادوں اور زمینوں پر ناجائز تسلط اور کچھ خاص افراد کو ناحق بخش دیئے جانے والے اموال واملاک کو پلٹانے پر تاکید کی تھی، اب اگر آپؑ ظاہری تخت خلافت کے حصول کے بعد فدک کی جاگیر سیدہ زہرا سلام اللہ علیہا کی اولاد کو پلٹا دیتے تو شاید کچھ لوگ یہ خیال کرتے کہ آپؑ نے وہ سب تاکید درحقیقت اپنے مفاد کے لیے کی تھی؛ یا یہ کہتے کہ: ''علیؑ نے خلافت سے ناجائز فائدہ

(۱) علل الشرائع(شیخ صدوق): ج ۱ ص ۱۵۵، باب ۱۲۴، حدیث ۳.

اٹھاتے ہوئے سابقہ خلفاء کے دور میں متنازع زمین اپنی اولاد کے نام کردی ہے، یا یہ بات مشہور کردیتے کہ حضرت علیؑ نے صرف فدک کی جاگیر کے حصول کے لئے خلافت سنبھالی ہے'' اور معاویہ بھی اسی بات کو بہانہ بنا کر لوگوں کی نظروں میں حضرت علیؑ کا مقام گرانے کی کوشش کرتا؛ چنانچہ امیر المومنینؑ نے اپنے اس حق سے چشم پوشی کرتے ہوئے فدک کے معاملہ کو نہ اٹھایا، اور آپؑ کے بعد دوسرے آئمہ معصومینؑ نے بھی آپ کے اسی عمل کی پیروی کی۔

چہارم: حضرت علی علیہ السلام کے دور حکومت میں سیاسی حالات کا تقاضا بھی یہی تھا کہ آپؑ فدک کے مسئلہ کو نہ چھیڑیں کیونکہ اکثر لوگ شیخین (جناب ابوبکر اور عمر) کی سنت کے معتقد، اور ان کے ہر اقدام کو برحق سمجھتے تھے۔

نیز حضرت علیؑ کو فدک غصب ہونے کے پچیس سال بعد ظاہری خلافت ملی اور اس طویل عرصہ میں عام لوگ خلفاء کی سیاست کے سبب یہ بات تسلیم کر چکے تھے کہ فدک بیت المال کا حصہ ہے اس کے علاوہ سابقہ خلفاء نے عام لوگوں کو فدک کی درآمد میں سے کچھ مراعات بھی دے رکھی تھیں، پس ایسی صورت میں حضرت علیؑ کیلئے کوئی ایسا اقدام ناممکن تھا کہ جس سے سابقہ خلفاء پر حرف آتا یا فدک کی درآمد سے مراعات حاصل کرنے والے لوگ آپؑ کے خلاف زبان درازی کرتے۔

حضرت علیؑ کو اس بات کا پہلے سے تجربہ تھا کیونکہ جب آپؑ نے لوگوں کو دوسرے خلیفہ کی ایجاد کی ہوئی بدعت (نماز تراویح) سے منع فرمایا تو لوگوں نے اس بدعت سے باز رہنے کی بجائے **واعمراہ واعمراہ** (ہائے عمر، ہائے عمر) کی فریاد بلند کرنا شروع کردی، حضرت علیؑ نے یہ دیکھ کر لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا؛ ایسے حالات میں حضرت علی علیہ السلام کے لیے فدک کے سلسلہ

میں خاموشی کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں تھا(۱)۔

پنجم: یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت علیؑ کا فدک واپس نہ پلٹانا اہل بیتؑ کے شدید غصہ اور غضب کی علامت ہے نیز یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آل محمدؑ فدک کے غاصبوں سے سخت انتقام لینا چاہتے ہیں کیونکہ اگر فدک واپس لے لیا جاتا تو یقیناً غاصب جس اُخروی عذاب کے حقدار تھے اس میں کمی ہو جاتی۔

ششم: اگر فدک اہل بیتؑ کا حق نہ ہوتا تو رسول خداﷺ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہؑ، جناب ابوبکر کے پاس فدک کا حق مانگنے کیوں گئیں؟!، اور اپنے اس حق پر گواہ کیوں پیش کیے؟!

اور جب جناب ابوبکر اور جناب عمر نے حضرت فاطمہ زہراؑ کو فدک دینے سے انکار کر دیا تو اُس کے بعد چھ ماہ تک رسول خداﷺ کی لخت جگر خلیفہ اول اور دوم سے ناراض کیوں رہیں؟!!!(۲)۔

---

(۱) "لما قدم أمير المؤمنين عليه السلام الكوفة أمر الحسن بن علي عليه السلام أن ينادي في الناس: لاصلاة (التراويح) في شهر رمضان في المساجد جماعة، فنادى في الناس بما أمره به أبوه أمير المؤمنين عليه السلام، فلما سمع الناس مقالة الحسن بن علي عليه السلام صاحوا: واعمراه واعمراه، فلما رجع الحسن إلى أمير المؤمنين عليه السلام قال له: ما هذا الصوت؟ فقال: يا أمير المؤ منين، الناس يصيحون: واعمراه، واعمراه؛ فقال أمير المؤمنين عليه السلام: قل لهم: صلّوا (كتاب سليم بن قيس: ص ۲۶۴).

ابن ابی الحدید نے نقل کیا ہے: وقد روى أن أمير المؤمنين عليه السلام لما اجتمعوا إليه بالكوفة فسألوه أن ينصب لهم إماما يصلي بهم نافلة شهر رمضان، زجرهم وعرفهم أن ذلك خلاف السنة، فتركوه واجتمعوا لانفسهم وقدموا بعضهم فبعث إليهم ابنه الحسن عليه السلام فدخل عليهم المسجد ومعه الدرّة فلما رأوه تبادروا الابواب وصاحوا واعمراه (شرح نهج البلاغه (ابن ابی الحدید): ج ۱۲ ص ۲۸۳)

(۲) صحيح (بخاری) كتاب المغازي، باب غزوه خيبر.

ہفتم: اگر فدک اہل بیت علیہم السلام کا حق نہیں تھا تو صحیح مسلم کی روایت کے مطابق حضرت علیؑ اور حضرت ابن عباس، خلیفہ اول اور ثانی کو جھوٹا، گناہ کار، دھوکے باز اور خائن کیوں سمجھتے رہے؟!!!(۱)۔

جبکہ اہل سنت کی معتبر کتب کے مطابق دوسرے خلیفہ جناب عمر بن خطاب کے بقول، حضرت علیؑ خلیفہ اول اور دوم کے بارے میں ایسا ہی نظریہ رکھتا تھے۔

ہشتم: اگر فدک اہل بیت علیہم السلام کا حق نہیں تھا تو پھر عمر بن عبدالعزیز نے اپنی خلافت کے دور میں فدک کی جاگیر، اہل بیت علیہم السلام کو پلٹانے کا تاریخی حکم کیوں صادر کیا؟!!!

(۱) اس بارے میں روایت کا ذکر سوال نمبر 4 کے ضمن میں گزر چکا ہے۔

سوال نمبر 10:

کیا شیعہ حضرات موجودہ قرآن کو نہیں مانتے اور کیا وہ موجودہ قرآن میں تحریف یا کسی دوسرے قرآن کے قائل ہیں؟!

جواب:۔ قرآن مجید، دین اسلام کی بنیاد اور تمام اسلامی عقائد واحکام کا مصدر ہے لہذا اسے متنازع یا مشکوک بنانے کی کوشش صرف اسلام دشمن عناصر ہی کر سکتے ہیں البتہ بعض نافہم یا کم فہم مسلمان بھی شعوری یا لاشعوری طور پر، محض فرقہ ورانہ تعصب کے باعث اس پروپیگنڈا کو ہوا دیتے ہوئے اور اسلام دشمن سازشوں کا حصہ بنتے ہوئے شیعوں پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ موجودہ قرآن مجید پر ایمان نہیں رکھتے؛ جبکہ تمام مسلمانوں کو سوچنا چاہیے کہ کسی مسلمان مذہب پر اس طرح کے اعتراضات اس بات کا سبب بن سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی بنیادی کتاب قرآن مجید، ایک متنازعہ اور مشکوک حیثیت اختیار کر لے اور پھر اسلام دشمن عناصر اسی بات کو بہانہ بنا کر دین اسلام پر اعتراض شروع کر دیں۔

لہذا اسلامی مذاہب کی پیروی کرنے والے تمام افراد کو جان لینا چاہیے کہ شیعہ مسلمان اِسی موجودہ قرآن مجید پر کامل یقین رکھتے ہیں جو اسلامی معاشرے کے درمیان رائج ہے، نیز اِسی قرآن کی تلاوت کرنے کو باعثِ ثواب سمجھتے ہیں، اسی لیے بہت سے معتبر اور معروف شیعہ علماء نے تحریفِ قرآن کے عقیدہ کو واضح الفاظ میں ردّ کیا ہے، ہم اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے شیعہ معتبر علماء میں سے صرف دو علماء کے بیانات کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱: عظیم شیعہ عالم شیخ طوسیؒ نے ''التبیان'' کے مقدمہ میں تحریف قرآن کے نظریہ کو باطل قرار دیا ہے نیز انہوں نے آیت ﴿اَلیوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ...﴾ کے ذیل میں بھی اس نظریہ کی نفی کی ہے۔

۲: چھٹی صدی کے معروف شیعہ مفسر اور صاحب مجمع البیان، امین الاسلام طبرسیؒ نے سورہ فصّلت کی آیت ۴۲ ﴿لایَأتِیہِ البَاطِلُ مِنْ بَیْن یَدَیْہِ وَلامِنْ خَلْفِہ﴾ کے ذیل میں تحریف قرآن کے عقیدہ کو باطل قرار دیا ہے؛ لہذا اہل تشیع پر یہ اعتراض صحیح نہیں ہے کہ وہ موجودہ قرآن مجید کو نہیں مانتے یا کسی اور قرآن کے قائل ہیں، البتہ اگر کوئی اپنی کم علمی کے باعث اہل تشیع پر قرآن مجید میں تحریف کا عقیدہ ٹھونسنے کی کوشش کرے تو اُسے اس بات کی طرف بھی توجہ رکھنا چاہیے کہ اہل سنت کی اپنی معتبر کتب میں بہت سی ایسی روایات موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قرآن کی تحریف کے قائل ہیں اور ان کے نزدیک موجودہ قرآن میں سے بعض آیات کم ہوگئی ہیں۔

ذیل میں اہل سنت کی معتبر کتب میں سے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

۱: صحیح بخاری میں خلیفہ دوم کا قول موجود ہے کہ: **فکان ممّا أنزل الله آیة الرجم فقرأناها** ''قرآن میں آیتِ رجم موجود تھی اور ہم نے اُس کی تلاوت بھی کی''(۱)؛ جبکہ موجودہ قرآن میں یہ آیت موجود نہیں ہے، نیز جناب عمر ہی نے کہا: **لولا ان یقول الناس زاد عمر في کتاب الله لکتبت آیة الرجم بیدي** ''اگر مجھے لوگوں کی اس بات کا ڈر نہ ہوتا کہ وہ کہیں گے کہ عمر نے قرآن مجید میں اضافہ کر دیا ہے تو میں اپنے ہاتھ سے رجم والی آیت لکھ دیتا''۔

۲: اسی طرح صحیح بخاری میں جناب عمر ہی کا یہ قول بھی مذکور ہے: **انّا کنّا نقرأ فیما نقرأ من کتاب الله: ان لا ترغبوا عن آبائکم فانه کفر بکم** ''ہم قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے یہ آیت بھی پڑھا کرتے تھے: ''اپنے آباء واجداد سے منہ نہ موڑو کیونکہ یہ تمہارا کفر ہے'' جبکہ موجودہ

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الحدود، باب رجم الحبلی من الزنا.

قرآن میں اس آیت کا نام ونشان بھی نہیں(۱)۔

۳: اہل سنت کی معتبر ترین کتاب صحیح مسلم کی روایت کے مطابق قرآن مجید کے دوطویل سورہ فراموش کردیئے گئے اوراب موجودہ قرآن مجید میں موجودنہیں ہیں(۲)۔

۴: صحیح بخاری میں سورہ واللیل کی آیت نمبردواورتین کے بارے میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: بعض اصحاب سورہ واللیل کی ابتدائی آیات اس طرح پڑھا کرتے تھے:''واللیل اذا یغشی والنھاراذا تجلی والذکروالانثی ''(۳)جبکہ موجودہ قرآن میں مذکورہ آیات اس طرح ہیں: ﴿وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى وَالنَّهَارِاِذَا تَجَلّٰى وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالاُنْثٰى﴾۔

۵: بعض اہل سنت علماء نے اپنی کتب میں روایت کی ہے کہ ابن عباس قرآن مجید کی آیت متعہ ﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ﴾کو''الی اجل مسمّی ''کے اضافہ کے ساتھ پڑھا کرتے تھے،اور جب ان سے اس بارے میں پوچھا گیا توانہوں نے کہا:'' واللہ لانزلھا اللہ کذلک ''خدا کی قسم،اللہ تعالی نے یہ آیت اسی طرح نازل کی ہے(۳)۔

---

(۱) صحیح بخاری ، کتاب المحاربین من اھل الکفر والردۃ.

(۲)عن ابی الاسود ... انّا كُنّا نَقرَء سورة كُنّا نُشَبِّهُها في الطّولِ وَالشِّدّةِ بِبَراء ة فَانُسيتُها غَيرَ انّي قد حَفِظْتُ مِنُها لو كان لابن آدَمَ وَادِيانِ مِن مَال لابْتَغَى وَادِيا ثالثا ... وَكُنّا نَقرء سورة كُنّا نُشَبِّهُها باِحْدى المُسَبِّحات فَانُسيتُها غَيرَ انّي قد حَفِظْتُ مِنُها... ''ابی الاسود سے روایت ہے....ہم (قرآن میں)ایک سورت پڑھا کرتے جسے طول اور سخت وعیدوں میں سورہ توبہ کی مثل قرار دیتے تھے، پھر میں اسے بھول گیا البتہ صرف یہ آیت مجھے یادرہی: اگرآدمی کے پاس مال کے دومیدان ہوتے تب بھی وہ تیسرا میدان ڈھونڈتا رہتا...اورہم ایک اورسورت پڑھا کرتے تھے جسے مسبحات کی سورت جیسا قرار دیتے تھے پھر میں اسے بھی بھول گیا مگراس میں سے یہ آیت یادہے...''(صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب کراھۃ الحرص علی الدنیا).

(۳) صحیح(بخاری) کتاب تفسیر القرآن، سورہ واللیل.

(۳) المستدرک (حاکم): ج۲ ص۳۰۵، تفسیر سورہ نساء ؛ حاکم نے بیان کیا ہے کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی شرائط کے مطابق صحیح ہے لیکن انہوں نے اسے ذکرنہیں کیا؛ الدر المنثور (سیوطی): ج۲ص۱۴۰ ؛ شرح مسلم (نووی): ج۹، کتاب النکاح، باب نکاح المتعہ.

۶: اہل سنت مفسرین نے ابن مسعود سے روایت کی ہے: کنّا نقراء علی عهد رسول الله: یاایها الرسول بلّغ ماانزل الیک من ربک انّ علیا مولی المومنین وانْ لم تفعل فما بلّغت رسالته(۱)؛ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں یہ آیت اس طرح پڑھتے تھے: ''اے رسول اس امر کی تبلیغ کرو جو آپ کے رب کی طرف سے آپ کی طرف بھیجا گیا ہے کہ علی مومنوں کا مولی ہے، اور اگر آپ نے یہ کام نہ کیا تو آپ نے اللہ کا پیغام پہنچانے کا کوئی کام نہیں کیا''۔

۷: اہل سنت علماء نے نقل کیا ہے: عن عائشه قالت: کانت سوره الاحزاب تقراء في زمن النبي مائتي آية فلمّا کتب عثمان المصاحف لم نقدر منها الا ماهو الآن(۲). ''جناب عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی اکرمؐ کے زمانہ میں سورہ احزاب کی دوسو آیات تلاوت کی جاتی تھیں لیکن جب جناب عثمان نے قرآن مجید لکھا تو ہمیں موجودہ آیات کے علاوہ دوسری آیات نہیں ملی''۔

مذکورہ روایت کی بنا پر جناب عائشہ کے قول کے مطابق نبی اکرمؐ کے زمانہ میں سورہ احزاب دو سو آیات پر مشتمل تھی جبکہ موجودہ قرآن مجید میں صرف ۷۳ آیات موجود ہیں۔

اہل سنت کی متعبر کتب میں اور بھی بہت سی اسی طرح کی روایات موجود ہیں، اور اس سلسلہ میں حقیقت سے آشنائی چاہنے والوں کے لیے اہل سنت کی کتاب ''الاتقان'' کا مطالعہ کافی ہوگا، پس شیعوں کی طرف سے عملی اور قولی واضح انکار کے باوجود اُن پر تحریفِ قرآن یا کسی اور قرآن کے قائل ہونے کا الزام لگانے والوں کو اپنی معتبر کتب میں موجود مذکورہ روایات واقوال کے بارے میں فکر کرنا چاہیے، البتہ اہل تشیع ایسی کسی روایت کو قبول نہیں کرتے جس سے قرآن مجید میں لفظی کمی یا زیادتی ثابت ہوتی ہو، چاہے وہ روایت کتنی ہی معتبر کتاب میں موجود ہو۔

---

(۱) الدرالمنثور(سیوطی): ج ۲ ص ۲۹۸، سوره مائدة ؛ تفسیر فتح القدیر(شوکانی): ج ۲ ص ۶۰.

(۲) الدرالمنثور(سیوطی): ج ۲ ص ۲۹۸، تفسیر سوره مائدة.

سوال نمبر 11:

شیعہ حضرات وضو میں پاؤں پر مسح کیوں کرتے ہیں؟

اہل سنت کے چاروں ائمہ نے وضو میں پاؤں دھونے کا فتوی دیا ہے جبکہ شیعہ حضرات قرآن اور اہل بیت علیہم السلام کی پیروی کرتے ہوئے وضو میں پاؤں دھونا جائز نہیں سمجھتے بلکہ پاؤں پر مسح کرتے ہیں، اہل تشیع کے اس عمل کی حقانیت کے اثبات کیلئے چند قطعی دلائل پیش خدمت ہیں۔

اول: اس مسئلہ میں اہل تشیع کی سب سے محکم ترین دلیل قرآن مجید میں سے سورہ مائدہ کی آیت مبارکہ ہے جو واضح طور پر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وضو میں پاؤں کا مسح کرنا ضروری ہے، نہ کہ دھونا، چنانچہ اللہ تعالی نے سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۶ میں ارشاد فرمایا:

يَا أَيُّهَاالَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ

اے ایمان والو! جب تم نماز کیلئے اٹھو

فَاغْسِلُوا وُجُوْهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ

تو اپنے چہرے اور ہاتھوں کو کہنیوں تک دھولو،

وَامْسَحُوا بِرُؤُسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ(۱)

اور اپنے سروں اور پاؤں کا ٹخنوں تک مسح کرو''

---

(۱) اس آیت کے حوالے سے ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ابن عباس، حسن، عکرمہ، حمزہ اور ابن کثیر نے ''ارجلکم'' کو ''رؤس'' پر عطف کرتے ہوئے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، جو اس بات کی دلیل ہے کہ وضو میں پاؤں کا مسح ہی واجب ہے (تفسیر الدر المنثور (سیوطی): ج ۲ ص ۲۶۲، تفسیر آیت وضو)۔

یہ آیت مبارکہ واضح طور پر حکم خدا کو لوگوں کے سامنے پیش کر رہی ہے کہ وضو میں پاؤں کا مسح کرنا ضروری ہے، نہ کہ دھونا۔

دوم: ۔قرآن مجید کی مذکورہ آیت کے ساتھ ساتھ اہل سنت کی معتبر کتب میں موجود مختلف روایات بھی وضو میں پاؤں کے مسح پر دلالت کرتی ہیں، ذیل میں چند روایات ملاحظہ فرمائیں۔

۱:۔ عن ابن عباس قال: أبى الناس الاّ الغسل ولا أجد في كتاب الله الاّ المسح ''ابن عباس نے کہا: لوگوں نے (پاؤں) دھونا اختیار کیا ہے لیکن مجھے قرآن مجید سے مسح کے علاوہ کوئی اور حکم نہیں ملا''(۱)۔

۲:۔عن ابن عباس قال: الوضوء غسلتان ومسحتان ''ابن عباس سے روایت ہے کہ وضو، دو اعضاء (یعنی چہرہ اور بازو) کے دھونے اور دو (یعنی سر اور پاؤں) کے مسح کا نام ہے''(۲)۔

۳: ...عن عمه رفاعة بن رافع، أنه كان جالسا عند النبي ﷺ فقال: إنها لا تتمّ صلاة لاحد حتى يسبغ الوضوء كما أمره الله تعالى، يغسل وجهه ويديه إلى المرفقين، ويمسح برأسه ورجليه إلى الكعبين ''رفاعہ بن رافع سے روایت ہے کہ وہ رسول خدا ﷺ کے قریب بیٹھا تھا کہ آپؐ نے فرمایا: یقیناً کسی شخص کی نماز اُسوقت تک کامل نہیں ہے جب تک وہ اللہ تعالی کے حکم کے مطابق وضو نہ کرے، اپنے چہرے اور بازوں کو کہنیوں تک دھوئے، اور اپنے سر اور ٹخنوں تک پاؤں کا مسح کرے''(۳)۔

---

(۱)الدر المنثور (سيوطي): ج۲ص۲۶۲،تفسیر آیت وضو؛المصنف (ابن أبي شيبة الكوفي): ج ۱ ص ۳۲.

(۲) الدر المنثور (سيوطي): ج۲ص۲۶۲،تفسیر آیت وضو.

(۳) سنن ابن ماجه (ابن ماجه القزويني): ج ۱ ص ۱۵۶ ، باب ما جاء في الوضوء على أمر الله تعالى.

سوم: ۔اہل سنت کے بعض معتبر علماء ومفسرین نے بھی وضو میں پاؤں پر مسح کے جائز ہونے کا اقرار کیا ہے مثلا: اہل سنت کے مشہور مفسر محمد ابن جریر طبری نے وضو میں پاؤں کے مسح کے بارے میں روایات نقل کرتے ہوئے اس عمل کے جائز ہونے کا اقرار کیا ہے(۱)۔

اسی طرح اہل سنت علماء نے شعبی کا یہ قول بیان کیا ہے: **انما هو المسح على القدمين، ألا ترى أن ماكان عليه الغسل جعل عليه التيمم، وما كان عليه المسح أهمل، فلم يجعل عليه التيمم** ''پاؤں پر مسح کرنا ہی صحیح ہے، کیا تو نہیں جانتا کہ جن اعضاء کو وضو میں دھونا ضروری ہے انہی اعضاء پر تیمّم کا حکم دیا گیا ہے، اور جن اعضاء پر مسح ضروری ہے ان پر تیمّم کا حکم نہیں ہے''(۲)۔

اہل سنت، وضو میں پاؤں دھونا ضروری کیوں سمجھتے ہیں:

اب یہاں سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کی واضح آیت اور دیگر روایات کے باوجود اہل سنت حضرات وضو میں پاؤں دھونا ضروری کیوں سمجھتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اہل سنت کی صحاح ستہ میں سے صحیح بخاری، صحیح مسلم اور مسند أحمد بن حنبل میں عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے: **قال تخلّف عنا النبي ﷺ في سفرة سافرناها، فأدركنا وقد أرهقتنا الصلاة ونحن نتوضاء، فجعلنا نمسح على أرجلنا، فنادى بأعلى صوته، "ويل للاعقاب من النار" مرّتين او ثلاث مرّات** ''عبداللہ بن عمرو بیان کرتے ہیں

---

(۱) **أمر أن يمسح في التيمم ما أمر أن يغسل في الوضو وأبطل ما أمر أن يمسح في الوضوء الرأس والرجلان** ''وضو میں جن اعضاء کے دھونے کا حکم ہے تیمّم میں انہی پر مسح کا حکم دیا گیا ہے، اور وضو میں جن اعضاء کے مسح کا حکم دیا گیا ہے یعنی سر اور پاؤں، تیمّم میں اُن کو نظر انداز کیا گیا ہے'' (جامع البیان (ابن جریر طبری): ج۵ ص۱۵۷، طبع ۱۹۹۵، دار الفکر بیروت)

(۲) رجوع کریں: المصنف (ابن أبی شیبه الکوفی): ج ۱ ص ۳۰، طبع اول ۱۹۸۹، دار الفکر بیروت

کہ ایک مرتبہ سفر کے دوران پیغمبر اکرم ﷺ ہم سے پیچھے رہ گئے، پھر جب آپؐ ہم سے ملے تو ہم نماز کیلئے وضو کررہے تھے، پس ہم نے وضو میں پاؤں پر مسح کیا، پس رسول خدا ﷺ نے دو یا تین دفعہ بلند آواز سے پکارا: ''ایڑیوں کے لئے نارِ جہنم کی خرابی ہے''(۱)۔

اہل سنت اس روایت کو دلیل بناتے ہوئے وضو میں پاؤں دھونا ضروری سمجھتے ہیں لیکن مذکورہ روایت کے بارے میں چند نکات کی طرف توجہ ضروری ہے۔

۱:۔ جب قرآن کی واضح آیات سے کوئی چیز ثابت ہوجائے تو پھر کسی روایت کو دلیل بنا کر قرآنی حکم سے منہ پھیرنا جائز نہیں ہے، چاہے وہ روایت کتنی ہی معتبر کتاب میں موجود کیوں نہ ہو، پس جب قرآن مجید سے وضو میں پاؤں کا مسح ثابت ہے تو پھر کسی روایت کی بنا پر وضو میں پاؤں کے مسح کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

۲:۔ مذکورہ روایت کے مطابق پیغمبر اکرم ﷺ کے ساتھ ہمسفر تمام صحابہ کا وضو میں پاؤں پر مسح کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رسول خدا ﷺ کے زمانے میں وضو میں پاؤں پر مسح ہی کیا جاتا تھا وگرنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ان تمام صحابہ میں سے کوئی ایک بھی صحیح وضو کو نہ جانتا ہو اور سب کے سب پاؤں کو دھونے کی بجائے مسح کرلیں؟!

۳:۔ پیغمبر اکرم ﷺ کا صحابہ کرام کو سرزنش کرتے ہوئے فرمانا: **ویل للاعقاب من النار**، اس بات پر دلالت نہیں کرتا کہ وضو میں پاؤں کا دھونا واجب ہے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو آپؐ کو ''**ویل للممسوحین**'' (ہلاکت ہے مسح کرنے والوں کیلئے) فرمانا چاہیے تھا، پس مذکورہ روایت کے مطابق پیغمبر اکرم ﷺ نے پاؤں پر مسح کی تصدیق کی ہے، نہ کہ مسح سے منع فرمایا ہے۔

۴:۔ روایت میں ''**ویل للاعقاب من النار**'' کا جملہ بھی وضو میں پاؤں پر مسح ہی کو ثابت کرتا

---

(۱) صحیح (بخاری) کتاب الوضو، باب غسل الرجلین ولا یمسح.

ہے، کیونکہ پیغمبر اکرم ﷺ نے پاؤں پر مسح کی تصدیق فرمائی ہے البتہ مذکورہ جملہ سے آپؐ نے اپنے اصحاب کو پاؤں کے تلوؤں کی گندگی یا پلیدی کی وجہ سے سرزنش فرمائی ہے کیونکہ وہ سب سفر میں تھے اور سابقہ زمانے میں، پیدل اور صحراؤں کا سفر ہونے کی بناء پر پاؤں کا گندا ہونا ایک عام بات ہے پس آپؐ نے انہیں سرزنش فرمائی تا کہ اس طرح گندے پاؤں کے ساتھ نماز نہ پڑھیں۔

۵: ممکن ہے کہ رسول خدا ﷺ نے اپنے صحابہ کو اس لیے منع کیا ہو کہ وہ پاؤں کی ایڑیوں یا تلووں پر مسح کر رہے تھے، جبکہ وضو میں پاؤں کے صرف ظاہری حصے کا مسح کرنا واجب ہے، نہ کہ پورے پاؤں کا؛ اور چونکہ اصحاب پاؤں کے ظاہری حصے کا مسح نہیں کر رہے تھے اس لئے آپؐ نے انہیں ''**ویل للاعقاب من النار**'' کے الفاظ کے ساتھ سرزنش فرمائی۔

سوم: ۔اہل سنت کے بہت زیادہ علماء نے اپنی زبان وقلم یا اپنے وجدان وضمیر سے اقرار کیا ہے کہ قرآنی حکم کے مطابق وضو میں پاؤں پر مسح ہی کرنا چاہیے لیکن چار اماموں کے مذہب کی پیروی انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ قرآنی حکم کو نظر انداز کر دیں، جیسا کہ اہل سنت کے مشہور مفسر جناب فخر رازی نے سورہ مائدہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے، جب اپنے آپ کو اسی مشکل میں گرفتار دیکھا کہ اگر وضو میں پاؤں دھوئیں تو قرآن مجید کی آیت کی مخالفت ہوتی ہے اور اگر مسح کریں تو اہل سنت کی کتب میں مذکور بعض روایات اور مذہب اہل سنت کی مخالفت ہوتی ہے تو انہوں نے اپنے آپ کو اس مشکل سے نجات دلانے کیلئے ایک نیا راستہ اختیار کرتے ہوئے کہا: **انّ الغسل مشتمل علی المسح وأنّه أقرب الی الاحتیاط** (۱) ''دھونے سے مسح بھی ہو جاتا ہے اور دھونا ہی احتیاط کے زیادہ قریب ہے'' گویا اس طرح انہوں نے اپنے گمان میں آیت اور روایت دونوں پر عمل کر لیا؛ لیکن فخر رازی کی گفتار میں دقّت کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر مذکورہ آیت مبارکہ

---

(۱) تفسیر مفاتیح الغیب (فخر رازی)، آیت وضو کے ذیل میں۔

وضو میں پاؤں کے مسح پر دلالت نہ کرتی تو جناب فخر رازی کا یہ قول ''دھونا، مسح کے قائم مقام ہے یا دھونے سے مسح بھی ہو جاتا ہے'' بیجا اور فضول ہوتا۔

نیز فخر رازی کا یہ قول واضح مغالطہ ہے کیونکہ دھونا اور مسح کرنا عرفی و شرعی لحاظ سے دو الگ الگ حقیقت ہیں کیونکہ غَســـل (دھونے) میں عضو پر پانی کا جاری ہونا ضروری ہے جبکہ ''مسح'' میں صرف پانی سے تر ہاتھ کا پھیرنا ضروری ہے۔

چہارم: بعض اہل سنت علماء نے واضح الفاظ میں وہ روایات بھی نقل کی ہیں کہ جن کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وضو میں پاؤں پر مسح کیا کرتے تھے:

۱: معروف اہل سنت عالم، شوکانی نے اپنی کتاب نیل الأوطار میں طبرانی سے نقل کیا ہے کہ عباد بن تمیم نے اپنے باپ سے نقل کیا: ''میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ وضو میں پاؤں پر مسح کر رہے تھے(۱)۔

۲: ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) نے بھی مذکورہ حدیث کو نقل کیا ہے اور اس حدیث کے بعد تاکید کرتے ہوئے بیان کیا ہے: **ورجاله ثقات** ''اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں''(۲)۔

۳: ابن ابی شیبہ نے مسند عبداللہ بن زید مازنی سے نقل کیا ہے: **انّ النبي توضّاء فغسل وجهه ثلاثاً ويديه مرّتين ومسح رِجله مرّتين** ''نبی اکرمؐ نے وضو کیا پس آپؐ نے اپنے چہرے کو تین

---

(۱) رأيت رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يتوضأ و يمسح على رجليه (نيل الأوطار (شوكاني) ج ۱ ص ۱۶۹) شوکانی نے اس کے علاوہ بھی کئی احادیث ذکر کی ہیں جن سے وضو میں پاؤں کا مسح ثابت ہوتا ہے لیکن انہوں نے بعض روایات کو ضعیف کہہ کر اپنے نظریہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی اور جن روایات کا ضعیف ہونا ثابت نہیں کر سکے اُن کی تاویل کرنے کو کہا جبکہ بعض دوسرے اہل سنت علماء نے انہی احادیث کو صحیح قرار دیا ہے؛ رأيت رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم يتوضأ ويمسح [الماء] على رجليه؛ (المعجم الاوسط (طبراني): ج ۹ ص ۱۳۳).

(۲) الاصابة (ابن حجر) ج ۱ ص ۴۹۰.

مرتبہ دھویا، اور ہاتھوں کو دو مرتبہ دھویا، اور دو مرتبہ اپنے پاؤں کا مسح کیا‘‘(۱)۔

۴: علامہ جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) نے بھی اپنی تفسیر درمنثور میں آیت وضو کے ذیل میں کچھ روایات بیان کی ہیں کہ جن کے مطابق وضو میں پاؤں کا مسح ثابت ہے(۲)۔

پس قرآن مجید اور سنت رسولؐ سے وضو میں پاؤں کا مسح ہی ثابت ہے نہ کہ پاؤں کا دھونا۔

اب سوال یہ ہے کہ جب اہل سنت ہی کی کتب اور ان کے علماء کے نزدیک قرآن وسنت سے وضو میں پاؤں کا مسح ہی ثابت ہے تو اہل سنت کے درمیان پاؤں کا دھونا رائج کیوں ہے؟

اس کے دو اہم سبب ہیں:

۱:۔ مذاہب اربعہ (یعنی حنفیہ، مالکیہ، شافعیہ اور حنبلیہ) کی پیروی، انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ قرآن وسنت کے مخالف عمل کو اپنے دین کا جز بنالیں جبکہ اہل سنت خود بھی جانتے ہیں کہ ان کے پاس مذاہب اربعہ میں سے کسی ایک مذہب کی پیروی کے واجب وضروری ہونے پر کوئی عقلی ونقلی دلیل نہیں ہے۔

۲:۔ دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ بعض سابقہ حکّام اور خلفائے وقت، مذہب اہل بیتؑ سے بغض ودشمنی کی بناء پر ان کی مخالفت میں پاؤں دھونے پر تاکید کرتے اور عام لوگوں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ اس پر عمل کریں، جیسا کہ اہل سنت علماء نے نقل کیا ہے کہ راوی نے کہا: **انّ الحجاج خطبنا (بالأهواز) فقال: اغسلوا وجوهكم وأيديكم وامسحوا برؤسكم وأرجلكم وانّه ليس شيء من ابن آدم أقرب الى الخبث من قدميه فاغسلوا بطونهما وظهورهما وعراقيبهما** ’’حجاج نے اھواز میں خطبہ دیتے ہوئے وضو کی آیت پڑھی اور پھر کہا: انسان کے

---

(۱) کنز العمال (متقی ھندی) ج۹ ص ۴۵۱، حدیث ۲۶۹۲۲.

(۲) رجوع کریں: الدر المنثور (سیوطی): ج۲ ص ۲۶۲، ۲۶۳.

اعضاء میں سے پاؤں سے بڑھ کر کوئی اور عضو گندا نہیں ہوتا اس لیے اپنے پاؤں کو تلوؤں سمیت دھو یا کرو''(۱)۔

کیا ایسے مسلمانوں پر تعجب نہیں ہے جو خدا اور رسول کا حکم ماننے کی بجائے حجاج جیسے ظالم و جابر اور فاسق و فاجر کا حکم مانیں جبکہ وہ حکم بھی قرآن مجید کی واضح آیت کے مخالف ہو؟!

اسی طرح بعض غیر شیعہ علماء نے بھی اہل بیت علیہم السلام کے مذہب کی مخالفت کی بنا پر وضو میں پاؤں دھونے کا فتوی دیا ہے، جیسا کہ بعض متعصب علماء کا طریقہ کار ہی یہ تھا کہ وہ کسی بھی دینی مسئلے میں فتوی دیتے ہوئے مذہبِ اہل بیت علیہم السلام کی مخالفت کا خاص خیال رکھتے تھے(۲)۔

چنانچہ اس طرح سادہ لوح اہل سنت مسلمان بھائیوں کے درمیان وضو میں پاؤں دھونا رائج ہو گیا، اور وہ آج تک اس مسئلہ میں اپنے اسلاف کی بے چون و چرا تقلید پر ڈٹے ہوئے ہیں جبکہ قرآن مجید میں وضو میں پاؤں پر مسح کرنے کا حکم واضح طور پر موجود ہے، اسی لیے حضرت ابن عباس کہتے تھے: ''لوگ وضو میں پاؤں دھوتے ہیں لیکن مجھے قرآن مجید میں مسح کے علاوہ کوئی اور حکم نہیں ملا''(۳)؛ اسی طرح ابن عباس ہی نے بیان کیا ہے: **قد افترض اللہ غسلتین و مسحتین** ''اللہ تعالی نے (وضو میں) دو عضو (چہرہ اور بازو) کا دھونا اور دو عضو (سر اور پاؤں) کا مسح فرض کیا ہے(۴)۔

---

(۱) الدر المنثور (سیوطی): ج ۲ ص ۲۶۲، آیت وضو کی تفسیر

(۲) تفصیل کیلئے اسی کتاب کے آخری باب ''اہل سنت بھائیوں سے دو سوال'' ملاحظہ فرمائیں

(۳) الدر المنثور (سیوطي): ج ۲ ص ۲۶۲، آیت وضو کی تفسیر؛ المصنف (ابن أبي شيبة الكوفي): ج ۱ ص ۳۲.

(۴) الدر المنثور (سیوطی): ج ۲ ص ۲۶۲، آیت وضو کی تفسیر

سوال نمبر 12:

شیعہ، ہاتھ کھول کر نماز کیوں پڑھتے ہیں نیز کیا ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنا صحیح نہیں ہے؟

جواب: اس سوال کے جواب کیلئے چند نکات کی طرف توجہ ضروری ہے:

اول: اہل سنت کے چار مذاہب میں سے کوئی بھی مذہب نماز میں ہاتھ باندھنے کو واجب نہیں سمجھتا، مالکی مذہب کے علاوہ باقی تین مذہب (یعنی حنفی، شافعی، اور حنبلی) نماز میں ہاتھ باندھنے کو مستحب قرار دیتے ہیں(۱) (یعنی اگر نماز میں ہاتھ باندھ لیے جائیں تو ثواب ہے اور اگر نہ باندھے جائیں تو پھر بھی نماز صحیح ہے)؛ البتہ اہل سنت میں سے مالکی مذہب میں شیعوں کی طرح ہاتھ کھول کر نماز پڑھنا مستحب ہے، جس سے نماز میں ہاتھ کھلے رکھنے کے قول کو تقویت ملتی ہے۔

دوم: ابھی تک اہل سنت کے پائیدار فقہاء میں سے کسی فقیہ و مفتی نے ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے کو واجب قرار نہیں دیا اور نہ ہی ہاتھ کھول کر نماز پڑھنے کو نماز کے باطل ہونے کا سبب قرار دیا ہے، جبکہ تمام شیعہ فقہاء نماز میں ہاتھ باندھنے کو نماز کے باطل ہونے کا سبب قرار دیتے ہیں، جس سے نماز میں ہاتھ کھلے رکھنے کی تائید ہوتی ہے کیونکہ ہاتھ کھول کر نماز پڑھنا تمام شیعہ و اہل سنت فقہاء کے نزدیک صحیح ہے۔

---

(۱) وضع اليد اليمنى على اليسرى فهو أيضاً من سنن الصلاة (فتاوى اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء (عبدالرزاق): ج۶ ص ۳۶۰)؛ المحلّى (ابن حزم): ج۴ ص ۱۱۲؛ ومسألة يستحب أن يضع ... .

(۲) اہل سنت کی معتبر کتب میں چھان بین کے بعد، نماز میں ہاتھ باندھنے سے متعلق صرف تین روایت ملتی ہیں۔

سوم: اہل سنت کی کتب میں سے نماز میں ہاتھ باندھنے پر ایک بھی صحیح روایت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل نہیں ہوئی، البتہ اس سلسلہ میں جن روایات (۲) کو دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے وہ یا تو سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں اور یا دلالت کے لحاظ سے، نیز اہل سنت کی معتبر کتب میں سے جن روایات میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز کی کیفیت بیان کی گئی ہے ان میں سے اکثر روایات میں ہاتھ باندھنے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔

البتہ ہاتھ باندھنے کی دلیل کے طور پر بخاری اور مسلم کی دو روایت پیش کی جاتی ہیں جن کی سند مرسل (۱) ہے اور دلالت کے اعتبار سے بھی دونوں مخدوش ہیں، جیسے کہ اہل سنت کے امام عینی (۲)، شوکانی (۳) اور سیوطی (۴) نے اس بات کی تصریح کی ہے، اس کے باوجود نجانے اہل سنت، نماز میں ہاتھ باندھنے پر اتنا اصرار کیوں کرتے ہیں؟

چہارم: اہل بیت علیہم السلام کی روایات میں نماز میں ہاتھ باندھنے کو مجوسیوں کا طریقہ اور بدعت شمار کرتے ہوئے اس عمل کی سختی سے مخالفت کی گئی ہے (۵)؛ اور چونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اہل بیت علیہم السلام کی پیروی ہی کو نجات کا ذریعہ قرار دیا ہے لہذا نماز کی ادائیگی کے طریقہ میں بھی انہی کی پیروی کرنا چاہیے۔

پس مندرجہ بالا نکات سے واضح ہوتا ہے کہ نماز میں ہاتھ باندھنے کا مسئلہ ''سنت اور بدعت'' کے

---

(۱) مرسل ایسی حدیث کو کہا جاتا ہے کہ جس میں روایت کرنے والے تمام راویوں کے نام ذکر نہ کیے گئے ہو۔

(۲) عمدة القاري في شرح صحيح بخاري (عيني): ج ۵ ص ۲۷۸.

(۳) نيل الاوطار (شوكاني): ج ۲ ص ۱۸۷.

(۴) التوشيح على الجامع الصحيح (سيوطي): ج ۱ ص ۴۶۳.

(۵) لا تكفّر انّما يصنع ذلك المجوس ''نماز میں ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر مت رکھو کیونکہ یہ مجوسیوں کا طریقہ ہے'' (وسائل الشيعة: ج ۷، باب ۱۵، ابواب قواطع الصلاة).

درمیان حائل ہے لہذا اسے ترک کرنا بہتر ہے کیونکہ نماز میں ہاتھ باندھنا کسی بھی فرقہ کے نزدیک واجب وضروری نہیں ہے بلکہ ہاتھ کھول کر نماز پڑھنا تمام شیعہ وسنی مسلمانوں کے نزدیک صحیح ہے۔

پنجم: بعض اہل سنت علماء نے نماز میں ہاتھ باندھنے کی دلیل بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''ہاتھ باندھنا تواضع اور انکساری کی دلیل ہے'' جیسا کہ نووی نے بیان کیا ہے: **قال أصحابنا: ولأنّ وضع اليد على اليد أسلم له من العبث، وأحسن في التواضع والتضرع** ''ہمارے علماء نے کہا ہے: (نماز میں ہاتھ باندھنا چاہیے) کیونکہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر قرار دینا فضول وعبث فعل سے بچاؤ اور تواضع وانکساری کیلئے بہترین (حالت) ہے''(۱)۔

لیکن اس دلیل کا جواب یہ ہے: تمام علماء اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ توقیفی عبادات(۲) میں کسی چیز یا فعل کو صرف قرآن یا سنت کی دلیل سے ثابت کیا جاسکتا ہے وگرنہ کسی بھی عبادت میں کسی چیز کا اضافہ حرام اور بدعت ہوگا، پس نہ تو قرآن سے ثابت ہے کہ ہاتھ باندھنا تواضع کی علامت ہے اور نہ ہی روایات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے، اور اگر کوئی اس فعل کو تواضع سمجھتا بھی ہے تب بھی اسے نماز میں انجام نہیں دیا جاسکتا کیونکہ نماز خداوند کی عبادت ہے اور اسے ویسے ہی انجام دینا ہوگا جیسے خدا نے کہا ہے، نہ کہ اپنی مرضی وعقل کے مطابق۔

ششم: اہل سنت کی بعض معتبر کتب میں موجود روایات سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں نماز میں ہاتھ نہیں باندھے جاتے تھے لہذا نماز میں ہاتھ باندھنا ایسی بدعت ہے جسے آپؐ کے بعد ایجاد کیا گیا اور پھر یہ بدعت معاشرے میں پھیلا دی گئی، جیسا کہ اہل سنت کے امام مالک نے سہل بن سعد کی یہ روایت نقل کی ہے: **كان الناس يؤمرون ان يضع**

---

(۱) المجموع (نووي): ج۳ص۳۱۳۔

(۲) توقیفی عبادات ایسے افعال کو کہتے ہیں کہ جنہیں خاص طریقے کے مطابق بجالانے کا حکم خداوند نے دیا ہو۔

الرجل اليد اليمنى على ذراعه اليسرى في الصلاة ''لوگ یہ حکم دیتے تھے کہ مرد نماز میں دائیں ہاتھ کو اپنی بائیں کلائی پر رکھے''(۱)؛ اس روایت کے الفاظ پر غور کرنے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز میں ہاتھ باندھنے کا حکم دیا تھا تو راوی نے کان الناس یؤمرون (لوگ حکم دیا کرتے تھے) کیوں کہا، بلکہ اُسے کان النبي یأمر (نبی حکم دیتے تھے) کہنا چاہیے تھا؟!، پس مذکورہ روایت کے الفاظ سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ نماز میں ہاتھ باندھنے کی بدعت کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد بعض افراد نے معاشرے میں رائج کیا کیونکہ اُن کی نظر میں نماز میں ہاتھ باندھنا خشوع وخضوع کی علامت تھا۔

ہفتم: اہل سنت کے بعض معتبر علماء نے اقرار کیا ہے کہ نماز میں ہاتھ باندھنا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے ثابت نہیں، جیسے قرطبی (متوفی ۵۹۵ھ) نے بیان کیا ہے: ''أنه قد جائت آثار ثابتة نقلت فيها صفة صلاته عليه الصلاة والسلام ولم ينقل فيها أنه كان يضع يده اليمنى على اليسرى .... ورأى قوم أن الأوجب المصير الى الاثار التي ليس فيها هذه الزيادة ... ''وہ صحیح روایات جن میں پیغمبر اکرمؐ کی نماز کا طریقہ بیان ہوا ہے ان میں یہ نہیں ملتا کہ آپؐ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھا کرتے تھے...اور کچھ علماء کا نظریہ یہ ہے کہ انہی روایات کو قبول کرنا زیادہ بہتر ہے جن میں یہ اضافہ (ہاتھوں کو باندھنا) بیان نہیں ہوا''(۲)۔

ہشتم: نماز میں ہاتھ باندھنے کے مسئلہ میں خود اہل سنت کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے،

---

(۱) الموطأ (امام مالک): ص۱۵۸، باب وضع اليدين احداهما على الاخرى؛ المحلى (ابن حزم): ج۴ص۱۱۴، مسألة يسحب أن يكبر الامام...؛ نيل الاوطار (شوكانى): ج۲ص۲۰۱، باب ما جاء فى وضع اليمين....

(۲) بداية المجتهد (قرطبى): ج۱ص۱۱۲.

بعض نے ناف کے اوپر ہاتھ باندھنے کا فتوی دیا ہے اور بعض نے ناف کے نیچے، جبکہ بعض سینے پر ہاتھ باندھنے کا حکم دیتے ہیں؛ اسی طرح بعض نے اس بات میں بھی اختلاف کیا ہے کہ دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھنا چاہیے یا بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ پر!!!

یعنی اہل سنت کے درمیان نماز میں ہاتھ باندھنے کی کیفیت بھی واضح نہیں ہے اور نہ ہی کسی ایک کیفیت پر تمام اہل سنت کا اتفاق ہے، اور نماز میں ہاتھ باندھنے کی کیفیت میں یہ اختلاف بھی ہاتھ باندھنے کے عمل کے مشکوک ہونے کا سبب ہے۔

نہم: ہاتھ کھلے رکھنا ایک فطری حالت ہے، اس طرح کہ اگر کوئی شخص ہاتھ کھولے کھڑا ہو تو کوئی اس سے ہاتھ کھلے رکھنے کا سبب نہیں پوچھے گا لیکن اس کے برعکس اگر کوئی ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو تو اس سے پوچھا جائے گا کہ تو ہاتھ باندھے کیوں کھڑا ہے؟ پس نماز میں بھی ہاتھ کھلے ہونا ایک فطری حالت ہے اور دین اسلام، فطرت کے عین مطابق ہے لہذا نماز میں ہاتھ کھلے رکھنے والوں کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ یہ ایک فطری حالت ہے البتہ ہاتھ باندھنے والوں کو کوئی قطعی دلیل پیش کرنا ہو گی کہ وہ کس بنا پر نماز میں ہاتھ باندھتے ہیں اور اُن کے پاس اس عمل کی کیا دلیل ہے؟

دہم: چونکہ شیعوں کی طرح ہاتھ کھول کر نماز پڑھنا اہل سنت کے چاروں مذہب (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) کے نزدیک جائز ہے لہذا اس مسئلہ میں شیعوں پر اعتراض کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ اہل سنت کی طرف سے یہ اعتراض صرف جہالت یا لجاجت ہے کیونکہ یہ اعتراض اُس صورت میں صحیح ہوگا کہ اگر اہل سنت کے نزدیک ہاتھ کھول کر نماز پڑھنا جائز نہ ہو؛ البتہ اہل تشیع کی طرف سے اہل سنت پر یہ اعتراض بجا ہے کہ وہ ہاتھ باندھ کر نماز نہ پڑھیں کیونکہ اہل تشیع فقہاء کے نزدیک اہل بیت علیہم السلام کے فرامین کے مطابق نماز میں ہاتھ باندھنا نماز کے باطل ہونے کا سبب ہے۔

سوال نمبر 13:

شیعہ حضرات دونمازیں ایک ساتھ کیوں پڑھتے ہیں؟

اس سوال کے جواب کیلئے چند نکات کی طرف توجہ ضروری ہے:

اول: اللہ تعالی نے قرآن مجید میں واجب نمازوں کے اوقات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿أَقِمِ الصَّلاةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ اِلى غَسَقِ الَّيْلِ وَقرآنَ الفَجْرِ﴾ ''نماز قائم کرو زوالِ آفتاب سے رات کی تاریکی تک، اور فجر کے وقت'' (۱)؛ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالی نے نماز کے صرف تین ہی اوقات بیان فرمائے ہیں، دونمازوں کو زوال سے وابستہ کیا ہے اور دو کو رات کی تاریکی سے، اور ایک نماز کو فجر سے۔

اسی طرح ایک مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿أَقِمِ الصَّلاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِنَ الَّيْلِ﴾ (۲) ''نماز قائم کرو، دن کی دونوں طرفوں اور رات کے کچھ حصہ میں''؛ مذکورہ آیت مبارکہ سے بھی نماز کے تین اوقات ہی کی طرف راہنمائی ملتی ہے، پس پانچ نمازوں کو تین اوقات میں ادا کرنے پر اعتراض کرنا قرآن مجید کے مفاہیم سے ناواقفیت کی واضح دلیل ہے۔

دوم: اہل سنت کی معتبر کتب میں بہت سی روایات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ دونمازیں ایک ساتھ ادا کرنا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے ثابت ہے؛ چند روایات ملاحظہ فرمائیں:

۱: عن ابن عباس، قال: ان النبي صلى الله عليه وسلم صلّى بالمدينة سبعا وثمانيا

---

(۱) سورہ اسراء (۱۷): ۷۸۔ (۲) سورہ ھود (۱۱): ۱۱۴۔

الظهر والعصر ، والمغرب والعشاء (۱)؛ ''ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے مدینہ میں ظہر اور عصر کی آٹھ رکعت اور مغرب وعشاء کی سات رکعت نماز ادا کی''۔

۲:۔ عن ابن عباس، قال: صلى رسول الله ﷺ الظهر والعصر جميعا والمغرب والعشاء جميعا في غير خوف ولا سفر ؛ ''ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ ادا کیا جبکہ آپ کو نہ تو کسی چیز کا خوف تھا اور نہ ہی آپ سفر میں تھے''(۲)۔

۳: عن ابن عباس، قال: صلى رسول الله ﷺ الظهر والعصر جميعا بالمدينة في غير خوف ولا سفر، قال أبو الزبير: فسألت سعيدا: لِمَ فعل ذلك؟ فقال: سألت ابن عباس كما سألتني فقال: أراد أن لا يحرج أحدا من امّته ؛''ابن عباس بیان کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے مدینہ میں ظہر وعصر کی نمازوں کو ایک ساتھ ادا کیا جبکہ آپ کو نہ تو کسی چیز کا خوف تھا اور نہ ہی آپ سفر میں تھے، ابوزبیر کہتے ہیں کہ میں نے سعید سے پوچھا: رسول خدا ﷺ نے ایسا کیوں کیا؟ تو سعید نے کہا: میں نے ابن عباس سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا: پیغمبر اکرم ﷺ یہ چاہتے تھے کہ آپ کی امت کا کوئی فرد مشکل میں گرفتار نہ ہو''(۳)۔

۴: اہل سنت کی معتبر کتب میں ہی ابن عباس کا یہ قول بھی واضح الفاظ میں موجود ہے کہ: كنّا نجمع

---

(۱) صحيح (بخاری) كتاب مواقيت الصلاة باب وقت المغرب؛ مسند (أحمد بن حنبل) ج ۱ ص ۱۲۱.

(۲) صحيح (مسلم): ج ۲ ص ۱۵۱، كتاب صلاة المسافرين، باب الجمع بين الصلاتين في الحضر؛ سنن (ابی داؤد): ج ۱ ص ۲۷۱، كتاب الصلاة، باب الجمع بين الصلاتين؛ سنن (نسائی): ج ۱ ص ۲۹۰، كتاب المواقيت، باب الوقت الذي يجمع فيه، الجمع بين الصلاتين في الحضر.

(۳) صحيح (مسلم) كتاب صلاة المسافرين، باب الجمع بين الصلاتين في الحضر.

بین الصلاتین علی عهد رسول الله ﷺ ؛ ''ہم لوگ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں دونمازیں ایک ساتھ پڑھا کرتے تھے''(۱)۔

اسی طرح ابن عباس کا یہ قول بھی موجود ہے: **رأیت رسول الله** ﷺ **جمع بین الظهر والعصر، والمغرب والعشاء** ''میں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ نے ظہر وعصر کی نماز اکٹھی پڑھی، اور مغرب وعشاء کی نماز بھی؛ راوی نے ابوھریرہ سے ابن عباس کے اس قول کے بارے میں پوچھا تو ابوھریرہ نے بھی اس کی تائید کی(۲)۔

خلاصہ یہ کہ ظہر وعصر اور مغرب وعشاء کی نمازوں کو ایک ساتھ ادا کرنا قرآن مجید سے بھی ثابت ہے اور اہل سنت کی معتبر کتب میں موجود روایات سے بھی، لہذا ان واضح دلائل کے باوجود، دو نمازیں اکٹھی پڑھنے کی بناء پر اعتراض کرنا، قرآن واحادیث سے ناواقفیت اور جہالت یا لجاجت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

---

(۱) صحیح (مسلم): ج۲، باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر؛ مسند احمد (احمد بن حنبل): ج ۱ ص ۳۵۱، مسند عبدالله بن العباس بن عبد المطلب.

(۲) حواله سابق

سوال نمبر 14:

شیعہ حضرات نماز میں مٹی پر کیوں سجدہ کرتے ہیں؟

نماز کے دوران سجدہ کی جگہ کی شرائط کے بارے میں مسلمان علماء کے درمیان اختلافِ نظر موجود ہے اہل تشیع ،اہل بیتؑ کی پیروی کرتے ہوئے اس بات کے قائل ہیں کہ سجدہ صرف زمین یا ایسی چیزوں پر جائز ہے کہ جو زمین سے اگتی یا نکلتی ہوں لیکن کھانے یا پہننے کیلئے استعمال نہ ہوتی ہوں اور اس بارے میں شیعوں کی کتب میں بہت سی روایات موجود ہیں۔البتہ بہت سے اہل سنت مسلمان یہ سوال پوچھتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ شیعہ حضرات نماز میں مٹی پر کیوں سجدہ کرتے ہیں اور قالین وغیرہ پر سجدہ جائز کیوں نہیں سمجھتے ؟اس مسئلے میں برادران اسلام کی تسلی کیلئے چند اہم نکات ذکر کرتے ہیں:

اول: شیعہ حضرات جن چیزوں پر سجدہ جائز سمجھتے ہیں اہل سنت کے نزدیک بھی ان چیزوں پر سجدہ کرنا جائز ہے،لہذا اس مسئلہ میں شیعوں پر اعتراض صحیح نہیں کیونکہ یہ اعتراض اُس صورت میں صحیح ہوگا کہ اگر اہل سنت کے نزدیک اُن چیزوں پر سجدہ جائز نہ ہو جن پر شیعہ حضرات سجدہ کرتے ہیں۔

دوم: بہت سے اہل سنت محدثین نے اپنی کتب میں رسول خداﷺ سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے زمین کو اپنے لیے سجدہ گاہ قرار دیا تھا چنانچہ آپؐ نے فرمایا: جُعِلَتْ لي الارض مسجداً وطهورًا ''زمین کو میرے لیے سجدہ کی جگہ اور پاک کرنے والی قرار دیا گیا ہے''(۱)؛ مذکورہ حدیث میں لفظ

(۱)صحیح (بخاری) کتاب الصلاة، باب تضل استقبال القبلة. سنن ابن ماجه: ج ۱ ص ۱۸۸ ،ط دار الفکر.

''جُعِلَتْ'' سے واضح ہوتا ہے کہ بنیادی طور پر حکم الٰہی یہ ہے کہ سجدہ زمین پر کیا جائے نیز اس حدیث سے خاک، پتھر اور ہر اُس چیز پر سجدہ کا جواز ثابت ہوتا ہے جسے زمین کہا جا سکے۔

اسی طرح بعض روایات کے مطابق رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ سجدہ کرتے وقت اپنی پیشانیوں کو خاک پر رکھیں جیسا کہ حضرت ام سلمہؓ روایت کرتی ہیں کہ پیغمبرؐ نے فرمایا: **تُـــربّ وجهک لله** ''اللہ کیلئے اپنے چہرے کو خاک پر رکھو''(۱)۔

اسی طرح اہل سنت کی معتبر کتب کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام صرف مٹی، پتھر یا کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائی (جسے خمرہ کہا جاتا ہے(۲)) پر سجدہ کرتے تھے، جیسا کہ حضرت انس روایت کرتے ہیں: **كـان رسـول الـله** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **يصلي على الخمرة و يسجد عليها** ''پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چٹائی پر نماز پڑھتے اور اسی پر سجدہ کیا کرتے تھے''(۳)۔

اسی طرح حضرت جابر بن عبداللہ انصاری بیان کرتے ہیں: **كـنـت أُصـلي مع رسول الله** صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **الظهر فآخذ قبضة من الحصى في كفّي حتى تبرد، وأضعها بجبهتي اذا سجدت مـن شـدّة الـحـرّ**(۴)؛ ''جب میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ نماز ظہر پڑھتا تھا تو اپنی مٹھی میں سنگریزے اٹھا لیتا تھا تا کہ وہ میرے ہاتھ میں ٹھنڈے ہو جائیں تا کہ سجدہ کے وقت انہیں اپنی پیشانی کے نیچے رکھ سکوں کیونکہ گرمی بہت شدید تھی''؛ پس اہل سنت کی معتبر کتب کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام کی عملی سیرت یہ تھی کہ وہ نماز میں پتھر، خاک یا ریت پر سجدہ کیا کرتے

---

(۱) سنن الترمذی: ج ۱ ص ۲۳۶، ط دار الفکر. مسند احمد: ج ۶ ص ۳۰۱، ط دار صادر بیروت.

(۲) الخمرة وهي حصيرة صغيرة تنسج من سعف: (تاج العروس).

(۳) صحيح (بخاری): كتاب الصلاة، باب الصلاة على الخمرة، و... ؛صحيح (مسلم): ج ۱ ص ۱۰۱.

(۴) السنن الكبرى(النسائی): ج ۲ باب تبريد الحصى.

تھے، لہذا مٹی پر سجدہ کرنا ہی سنت رسولؐ اور سیرت صحابہ ہے، نہ کہ قالین وغیرہ پر۔

سوم: اہل بیتؑ نے زمین اور مٹی وغیرہ پر سجدہ کرنے کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کیونکہ خاک یا مٹی پر سر رکھنا ہی اللہ تعالی کے سامنے زیادہ خضوع کی علامت ہے؛ چنانچہ جناب ھشام بن حکمؒ کہتے ہیں: میں نے حضرت امام جعفر صادقؑ سے پوچھا: آپ بتائیں کہ کن چیزوں پر سجدہ کرنا صحیح ہے اور کن چیزوں پر صحیح نہیں ہے؟ امامؑ نے فرمایا: سجدہ صرف زمین یا اس سے اگنے والی اشیاء پر ہوسکتا ہے لیکن کھانے یا پہننے (لباس) کے لیے استعمال نہ ہوتی ہوں؛ میں نے عرض کی: آپ پر قربان جاؤں، آخر اس کا سبب کیا ہے؟ امامؑ نے فرمایا: کیونکہ سجدہ اللہ تعالی کیلئے خضوع وخشوع کا نام ہے لہذا یہ صحیح نہیں ہے کہ کھانے اور پہننے والی چیزوں پر سجدہ کیا جائے کیونکہ دنیا پرست افراد خوراک اور لباس کے بندے ہیں جبکہ سجدہ کرنے والا سجدہ کی حالت میں اللہ عزوجل کی عبادت میں مشغول ہوتا ہے لہذا مناسب نہیں ہے کہ اپنی پیشانی ایسی چیز پر رکھے جس کو دنیا پرست اپنا معبود سمجھتے ہیں اور دنیا کے دھوکے میں آ گئے ہیں، زمین پر سجدہ کرنا ہی افضل ہے کیونکہ اس سے اللہ تعالی کی بارگاہ میں زیادہ تواضع اور خضوع کا اظہار ہوتا ہے(۱)۔

یہ روایت اس نکتہ کی طرف راہنمائی کرتی ہے کہ سجدہ اللہ تعالی کے سامنے خشوع وخضوع کے آخری درجہ کا نام ہے، اور خاک پر سجدہ کرنا (خواہ وہ سجدہ گاہ ہو یا خاک اور مٹی) خدا کے سامنے زیادہ خشوع وخضوع پر دلالت کرتا ہے کیونکہ خاک سب سے زیادہ حقیر چیز شمار ہوتی ہے لیکن اس کے مقابلے میں اگر کوئی انسان کسی قیمتی دھات، سونے چاندی کے ٹکڑے، یا قیمتی قالین وغیرہ پر سجدہ کرے تو عین ممکن ہے کہ اِس سے اُس کے خضوع وخشوع میں کمی آجائے، اور وہ قیمتی چیز پر سجدہ کرنے کی بنا پر اپنی بڑائی یا تکبر کا احساس کرنے لگے۔

---

(۱) بحار الانوار (مجلسي): ج۸۵ ص۱۴۷.

چہارم: گذشتہ روایات کے پیش نظر اہل سنت سے یہ سوال کرنا بجا ہے کہ وہ کس دلیل کی بناء پر قالین، دری یا کپڑے اور پلاسٹک کی چٹائی وغیرہ پر سجدہ کرتے ہیں جبکہ قالین یا ایسی چیزوں پر سجدہ کرنا نہ تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے ثابت ہے اور نہ ہی صحابہ کرام کی سیرت سے، بلکہ وہ زمین، خمرہ (درخت کے پتوں کی چٹائی)، خاک یا سنگریزوں پر سجدہ کیا کرتے تھے؟

پنجم: یہ خیال کرنا قطعا غلط ہے کہ شیعہ حضرات مٹی کے جس ڈھیلے یا خاک کی جس ٹکیا پر سجدہ کرتے ہیں وہ بت کی جگہ ہے لہذا ایسا کرنا شرک ہے، کیونکہ اگر کفار ومشرکوں کو بھی دیکھا جائے تو وہ بھی ''بتوں کو سجدہ کرتے ہیں، نہ کہ بتوں پر''؛ یعنی خاک کی ٹکیا (سجدہ گاہ) پر سجدہ کرنے کی بنا پر شیعوں کو شرک کا مجرم قرار دینے والے حقیقت میں ((مَسجُودٌ لَهٗ یعنی جس کو سجدہ کیا جائے)) اور ((مَسجُودٌ عَلَیهِ یعنی جس پر سجدہ کیا جائے)) میں فرق نہیں سمجھ سکے، یعنی ''کسی چیز کو سجدہ کرنا اور بات ہے جبکہ کسی چیز پر سجدہ کرنا دوسری بات ہے''؛ پس شیعہ حضرات خاک یا مٹی پر سجدہ کرتے ہیں، نہ کہ خاک کی اُس ٹکیا کو؛ بالکل اُسی طرح جیسے اہل سنت قالین وغیرہ پر سجدہ کرتے ہیں، نہ کہ قالین کو؛ لہذا خاک کی ٹکیا پر سجدہ کرنا ہرگز شرک نہیں ہے۔

ششم: شیعہ حضرات آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے فرامین کی بنا پر نماز میں خاک کربلا پر سجدہ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں، جیسا کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: **السجود علی تربة الحسین یخرق الحجب السبع** ''خاک شفا پر سجدہ کرنے سے سات حجاب ہٹ جاتے ہیں''؛ یعنی نماز قبولیت کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے، اور خاک کربلا کی فضیلت کا راز یہ ہے کہ امام حسین علیہ السلام اس سرزمین پر اپنے نانا کے دین کی راہ میں شہید ہوئے اور شریعت محمدی کی حفاظت وبقا کے لیے اپنی اور اپنے اہل بیت واصحاب کی جانیں قربان کر دیں اس وجہ سے اللہ تعالی نے خاک کربلا کو فضیلت عنایت فرمائی اور اسے خاک شفا بنا دیا۔

سوال نمبر 15:

کیا حضرت ابوطالب علیہ السلام مسلمان اور صاحب ایمان تھے؟

بعض اہل سنت حضرت ابوطالب علیہ السلام کے ایمان و اسلام کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ آپؑ کے ایمان کی کیا دلیل ہے اور وہ کب مسلمان ہوئے؟ جبکہ اہل تشیع کے عقیدہ کے مطابق حضرت ابوطالب علیہ السلام کبھی کافر نہیں تھے اس لیے یہ سوال ہی بے جا ہے کہ وہ کب مسلمان بنے، بلکہ وہ شروع ہی سے مومن و موحّد اور خدا پرست تھے؛ جیسا کہ امیر المومنین حضرت علیؑ نے فرمایا: ''خدا کی قسم میرے باپ، دادا عبدالمطلب، ھاشم اور عبد مناف نے کبھی بتوں کی عبادت نہیں کی، آپؑ سے پوچھا گیا: پس وہ کسی کی عبادت کرتے تھے؟ فرمایا: وہ حضرت ابراھیمؑ کے دین کی پیروی میں کعبہ کی طرف رخ کر کے عبادت کرتے تھے''(۱)۔

اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت ابوطالبؑ کے ایمان و اسلام کے دلائل کا دسواں حصہ بھی کسی اور شخص کے بارے میں ہوتا تو سب مسلمان اُس کے ایمان و اسلام کی تصدیق کرتے، لیکن اس کے باوجود بعض مسلمان آپؑ کے ایمان میں شک کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس غلط عقیدہ کی ترویج کا مقصد حضرت علیؑ کو تنقید کا نشانہ بنانے کے علاوہ کچھ نہیں ہے، بہرحال ذیل میں اس حوالے سے چند اہم نکات ملاحظہ فرمائیں۔

---

(۱) عن الاصبغ بن نباته قال: سمعت أمير المؤمنين صلوات الله عليه يقول: والله ما عبد أبي ولا اجدّي عبدالمطلب ولاهاشم ولا عبد مناف صنماً قط، قيل له: فما كانوا يعبدون؟ قال: كانوا يصلون إلى البيت على دين إبراهيم عليه السلام متمسكين به (كمال الدين: ج ۱ ص ۱۷۴)

اول: تاریخی حقائق اور اہل سنت کے معتبر مؤرخین کے مطابق حضرت ابوطالبؑ نے رسول خدا ﷺ کی سرپرستی کی اور اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک پیغمبر اکرم ﷺ کے سرپرست اور آپؐ کے محافظ و مددگار رہے؛ جبکہ قرآن مجید نے واضح الفاظ میں مومنوں کو منع فرمایا ہے کہ وہ کافروں کو اپنا سرپرست اور ولی نہ بنائیں لہذا ارشاد فرمایا: ﴿یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَائَکُمْ وَإِخْوَانَکُمْ أَوْلِیَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْإِیْمَانِ وَمَنْ یَتَوَلَّهُمْ مِنْکُمْ فَأُوْلَئِکَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ ''اے ایمان والو! اگر تمہارے آباء واجداد اور بھائی ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دیں تو تم انہیں اپنا ولی وسرپرست نہ بناؤ اور تم میں سے جو کوئی اُن سے محبت رکھے گا تو وہی لوگ ظالم ہیں''(۱)۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿یَاأَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْیَهُودَ وَالنَّصَارَیٰ أَوْلِیَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِیَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ یَتَوَلَّهُمْ مِنْکُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللهَ لَا یَهْدِیْ الْقَوْمَ الظَّالِمِیْنَ﴾ ''اے ایمان والو! تم یہود ونصاری کو دوست نہ بناؤ، وہ ایکدوسرے کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو انہیں دوست بنائے گا تو وہ یقیناً انہی میں سے ہوجائے گا، بے شک اللہ ظالم قوم کی ہدایت نہیں کرتا''(۲)۔

پس اگر حضرت ابوطالبؑ واقعا کافر تھے تو کیا یہ ممکن ہے کہ رسول خدا ﷺ ان آیات اور حکم خدا کی مخالفت کرتے ہوئے کسی کافر کو اپنا ولی اور سرپرست بنالیں؟!

دوم: حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کی ایک بہترین دلیل، اہل سنت کی معتبر تاریخی کتب میں مذکور ''**قصة الصحيفة**'' بھی ہے، چنانچہ مؤرخین نے بیان کیا ہے: کفار قریش نے مل کر بنی ھاشم

---

(۱) سورہ توبہ (۹) : آیت ۲۳.

(۲) سورہ مائدہ (۵): آیت ۵۱.

کے ساتھ بائیکاٹ سے متعلق ایک عہد نامہ تیار کیا، اور اس پر دستخط کر کے جِلد کی اور بیت اللہ کے اندر زمین کھود کر دفن کر دیا؛ پھر جب کچھ عرصہ حضرت جبرائیل نے رسول خدا ﷺ کو خبر پہنچائی کہ اللہ تعالی نے قریش کے صحیفہ (عقد نامہ) کی طرف چیونٹیوں (دیمک) کو بھیجا جو اسے کھا گئیں ہیں اور اس صحیفہ میں سے صرف وہی جگہ باقی ہے جہاں اللہ تعالی کا نام لکھا ہوا تھا؛ رسول خدا ﷺ نے یہ بات حضرت ابوطالب علیہ السلام کو بتائی، تو آپؑ مکمل یقین کے ساتھ خانہ کعبہ کے صحن میں آئے اور قریش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: **یا قوم أحضروا صحیفتکم**، اے لوگو تم اپنے عقد نامہ کو نکال کر دیکھو، خداوند نے محمدؐ کو خبر دی ہے اور آپؐ نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارے عقد نامہ کو چیونٹیاں کھا چکی ہیں اور اس میں سے صرف وہی جگہ باقی ہے جہاں اللہ تعالی کا نام لکھا ہوا تھا، اب اگر تم محمدؐ کو سچا پاؤ تو کیا کرو گے؟ سب نے کہا: ''ہم اس کی بات مان لیں گے لیکن اگر یہ بات غلط ثابت ہوئی تو تم اسے قتل کیلئے ہمارے حوالے کرو گے''، حضرت ابوطالب علیہ السلام نے یہ بات مان لی اور کہا: ''جاؤ اور وہ صحیفہ نکال کر لاؤ''، پھر انہوں نے دیکھا کہ عقد نامہ کا صرف وہ حصہ باقی تھا جس پر خدا کا نام تحریر تھا، یہ دیکھتے ہی کفارِ قریش نے کہا: ''یہ تو جادو ہے''(۱)۔

سوم: پیغمبر اکرم ﷺ نے حکمِ خدا کے تحت مسلمان عورت کا کافروں کے ساتھ نکاح، حرام قرار دیا اور تاریخ اسلام سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ حضرت فاطمہ بنت اسد سلام اللہ علیہا سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والی عورتوں میں سے تھیں، لیکن اس کے باوجود اپنی زندگی کے آخری ایام تک حضرت ابوطالب علیہ السلام کے نکاح میں رہیں، پس اگر حضرت ابوطالب علیہ السلام (نعوذ باللہ) کافر تھے تو پھر رسول خدا ﷺ نے فاطمہ بنت اسد کو حضرت ابوطالب علیہ السلام سے جدا ہونے کا حکم کیوں نہ دیا؟!

---

(۱) تاریخ یعقوبی ج۲ ص ۳۲، باب وفاة القاسم ابن رسول الله؛ البداية والنهاية (ابن كثير): ج۳ ص ۱۱۹، باب نقض الصحيفة، باب ماأخبر به من الكائنات المستقبلة: ص ۲۰۶؛....

چہارم: حضرت ابوطالبؑ کے بہت سے علمی وادبی اشعار آپؑ کے محکم ایمان کا واضح ثبوت ہیں، جن کا بہت سے اہل سنت مؤرخین نے بھی اپنی معتبر کتب میں ذکر کیا ہے، ذیل میں حضرت ابوطالبؑ کے بعض اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

۱): آپؑ نے قریش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

لیعلم خیار الناس انّ محمداً نبیّ کموسی والمسیح بن مریم

اتانابهدی مثل ما اتیابه فکل بأمر اللّه یهدی و یعصم

''سمجھدار لوگوں کو جان لینا چاہیے کہ حضرت محمدؐ بھی حضرت موسیٰؑ وعیسی بن مریمؑ کی طرح نبی ہیں، وہ ہماری ہدایت کیلئے آئے جیسا کہ دوسرے پیغمبر آئے تھے اور ہر نبی اللہ تعالی کے حکم سے ہدایت کرتا اور گناہوں سے روکتا ہے''(۱)۔

۲): جب قریش کے کچھ لوگ حضرت ابوطالبؑ کے پاس آئے اور رسول خداﷺ کو تحویل میں لینے کا مطالبہ کیا تو ابوطالبؑ نے انہیں ردّ کر دیا، پھر جب رسول خداﷺ کے پاس آئے تو آپؐ کو پریشان دیکھ کر کہا: اے محمدؐ، پریشان نہ ہوں:

واللّه لن یصلوا الیک بجمعهم حتی أوسد في التراب دفینا

فانفذ لامرک ماعلیک مخافة وأبشر وقر بذاک منه عیونا

ودعوتني و زعمت أنّک ناصحي ولقد صدقت و کنت قبل أمینا

وعرضت دینا قد علمتُ بأنّه من خیر ادیان البریة دینا

''خدا کی قسم سب قریش مل کر بھی تجھ تک نہیں پہنچ سکتے، یہاں تک کہ قبر کو بستر بنالوں اور مٹی میں دفن ہو جاؤں، آپؐ ہر طرح کے ڈر اور خوف کے بغیر اپنا حکم نافذ کریں، اس کی بشارت دیں اور آنکھوں

---

(۱) المستدرک (حاکم): ج۲ ص۶۲۳؛

کوروشن کردیں، آپؐ نے مجھے اپنے دین کی دعوت دی ہے اور میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے نصیحت کرنے والے ہیں، اور یقیناً آپؐ نے سچ کہا ہے اور آپؐ اس سے پہلے بھی امین تھے، آپؐ نے دین پیش کیا ہے اور یقیناً میں سمجھ گیا ہوں کہ یہ دین تمام مخلوقات کے ادیان سے بہترین ہے''(۱)۔

۳): اسی طرح حضرت ابوطالبؑ نے پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

انّ ابن آمنة النبي محمدا عندي بمثل منازل الأولاد

''یقیناً آمنہؑ کا فرزند محمدؐ نبی، میرے نزدیک اپنی اولاد کی طرح ہے(۲)

۴): اسی طرح بعض اہل سنت علماء نے حضرت ابوطالبؑ کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے:

يا شاهد الله عليّ فاشهد انّي على دين النبى أحمد

''اے مجھ پر خدا کے گواہ آپ گواہی دیجئے کہ میں احمد، خدا کے نبی کے دین پر ہوں''(۳)

تو کیا حضرت ابوطالبؑ کے یہ اشعار آپ کے راسخ ایمان کی نشاندہی نہیں کرتے؟! یقیناً یہ اشعار جناب ابوطالبؑ کے ایمان کی عکاسی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بعض انصاف پسند اہل سنت علماء نے ان اشعار کو حضرت ابوطالبؑ کے ایمان کی دلیل قرار دیا ہے جیسا کہ ابن ابی الحدید کہتے ہیں: **فكلّ هذه الاشعار قد جاء ت مجئ التواتر ... فمجموعها يدلّ على أمر واحد مشترك وهو تصديق محمد**ﷺ ''حضرت ابوطالبؑ کے یہ اشعار متواتر نقل ہوئے ہیں ...اور یہ تمام اشعار ایک مشترک نکتہ پر دلالت کرتے ہیں اور وہ یہ کہ ان میں رسول خداﷺ کی نبوت کا اقرار موجود ہے''(۴)؛ مذکورہ اشعار حضرت ابوطالبؑ کے ہزاروں اشعار میں سے بطور

---

(۱) شرح نهج البلاغة (ابن ابى الحديد): ج۱۴ ص۵۵.

(۲) تاريخ مدينة دمشق (ابن عساكر): ج۳ص ۱۲؛ مناقب آل ابى طالب (ابن شهر آشوب): ج۱ ص۲۷.

(۳) شرح نهج البلاغه (ابن ابى الحديد): ج۱۴ ص۸۷. (۴) حواله سابق

نمونہ پیش کیے گئے ہیں، جن سے ہر صاحب فہم وفراست آپؑ کے ایمان کے بارے میں صحیح فیصلہ آسانی کے ساتھ کرسکتا ہے۔

پنجم: اگر حضرت ابوطالبؑ کی سیرت کا مطالعہ کیا جائے تو آپؑ کا ایمان آپؑ کے کردار ورفتار سے جھلکتا ہوا نظر آتا ہے، حضرت ابوطالبؑ نے اپنی پوری زندگی رسول خداﷺ کا دفاع اور آپؐ کی حفاظت کرتے ہوئے گزاری، رسول خداﷺ پر حضرت ابوطالبؑ کا ایمان اتنا محکم تھا کہ آپؐ کی جان کی حفاظت کے لیے اپنے بیٹوں کی زندگی کو خطرہ میں ڈالا، راتوں کو اپنے بیٹے حضرت علیؑ کو رسول خداﷺ کے بستر پر سلاتے تاکہ اگر کفار ومشرکین حملہ کریں تو پیغمبر اکرمؐ کی زندگی محفوظ رہے۔

حضرت ابوطالبؑ ہی کی کوششوں کی بنا پر پیغمبر اکرمؐ کو دعوت ذوالعشیرہ میں اسلام کا پیغام پہنچانے کا موقعہ ملا کیونکہ جب دعوت ذوالعشیرہ کے تیسرے دن ابولہب نے رسول خداﷺ کی گفتگو میں خلل ڈالنا چاہا تو حضرت ابوطالبؑ نے فوراً اسے ڈانٹتے ہوئے کہا: اسکت یا اعور ''اے اندھے خاموش ہوجاؤ''. اور پھر رسول خداﷺ کو موقع ملا کہ آپؐ اپنی نبوت کا اعلان کرسکیں۔

ششم: بہت سے معتبر علماء ومؤرخین نے بیان کیا ہے: انّ اباطالب قال لعليّ عليه السلام يابنيّ: ... انّ محمداً لايدعو الا الى خير فالزمه ''حضرت ابوطالبؑ نے اپنے فرزند حضرت علیؑ کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: ''اے میرے بیٹے: ... پیغمبر خداﷺ تمہیں صرف نیکی کی طرف بلائیں گے لہذا کبھی ان کا ساتھ نہ چھوڑو'' (۲)؛ تو کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی کافر باپ اپنے بیٹے کو

---

(۱) سورہ شعراء (۲۶) : ۲۱۴.

(۲) تفسیر مجمع البیان (طبرسی): ج۵ ص۱۱۳؛ تاریخ الامم (طبری): ج۲ ص۵۸؛ أما أنه لم يدعک الا خيرا فالزمه (ينابيع المودة (قندوزی): ج۲ ص۱۴۸)

اس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع اور پیروی کا حکم دے؟!

ہفتم: تقریباً تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت خدیجہ علیہا السلام کا نکاح پڑھا تھا، آپؑ نے نکاح سے پہلے جو خطبہ پڑھا وہ ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے: **الحمد لله الذي جعلنا من ذرية ابراهيم، زرع اسماعيل...** ''تمام تعریفیں اُس اللہ کے لیے ہیں جس نے ہمیں ابراہیمؑ کی ذریت اور اسماعیل کی نسل میں سے قرار دیا...'' (۱)۔

تو کیا کوئی صاحب عقل یہ بات کہہ سکتا ہے کہ رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکاح پڑھتے ہوئے یہ الفاظ ادا کرنے والا (نعوذ باللہ) صاحب ایمان نہیں تھا؟!!!

ہشتم: حضرت ابوطالب علیہ السلام کے ایمان کی گواہی اہل بیت علیہم السلام سے منقول بہت سی روایات میں دی گئی ہے جیسا کہ اسی بحث کے شروع میں حضرت علیؑ کا فرمان نمونہ کے طور پر نقل کیا گیا ہے؛ اور یقیناً اہل بیت سلام اللہ علیہم کی گواہی کے مقابلے میں کسی اور کی گواہی یا روایت کو ہرگز قبول نہیں کیا جا سکتا۔

نہم: واضح رہے کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام کے ایمان میں شک کرنے کی تین وجوہات ہیں:

۱): اسلام کی ابتداء میں آپؑ کا ایمان چھپانا: حضرت ابوطالب علیہ السلام اسلام کی ابتداء میں اپنا ایمان چھپاتے رہے تا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفاع کر سکیں، جیسے مومن آل فرعون اور اصحاب کہف اپنا ایمان چھپاتے رہے۔

۲): منافقوں کے دلوں میں آپؑ کا کینہ: مشرکین اور منافقین نے دیکھا تھا کہ حضرت ابوطالب علیہ السلام ہی کی وجہ سے دین پھلا اور پھیلا، اور دین اسلام کی بنیادیں مظبوط ہوئیں، یہی وجہ تھی کہ منافقوں

---

(۱) شرح نهج البلاغة (ابن ابی الحدید): ج ۱۴ ص ۷۰؛ اعجاز القرآن (باقلانی): ص ۱۵۳؛ تاریخ ابن خلدون: ج ۲ ص ۵؛

کے دلوں میں حضرت ابوطالبؑ کا کینہ پیدا ہو گیا اور انہوں نے جعلی روایات کو مسلمانوں کے درمیان پھیلا کر گویا اپنے کینہ کی آگ ٹھنڈی کرنے کی کوشش کی۔

۳): حضرت علیؑ سے بغض وعداوت: جس طرح حضرت ابوطالبؑ اسلام کی تقویت اور اسکے پھلنے پھولنے کا سبب بنے اُسی طرح حضرت علیؑ بھی رسول خدا ﷺ کے زورِ بازو تھے، اور دعوت ذوالعشیرہ ہی سے رسول خدا ﷺ اور دین اسلام کی نصرت کا پرچم تھام لیا تھا یہی وجہ تھی کہ منافقوں کے دلوں میں حضرت علیؑ کا بغض وکینہ پیدا ہو گیا، اور اسی بغض کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے انہوں نے ایسی روایات کو ترویج دی کہ جن سے حضرت علیؑ کے والد ماجد کے ایمان میں شک پیدا ہو جائے۔

انہی اسباب کی بنا پر کچھ مسلمان حضرت ابوطالبؑ کے ایمان میں شک کرتے ہیں جبکہ آپؑ کے ایمان کے اثبات کیلئے اہل اسلام کی معتبر کتب میں فراوان دلائل موجود ہیں۔

منافق کیا سمجھیں گے ایمان ابوطالبؑ
ایماں کے سمجھنے کو ایماں کی ضرورت ہے

سوال نمبر 16:

کیا نکاح متعہ جائز ہے؟

اہل تشیع پر ہونے والے اعتراضات میں سے ایک اہم اعتراض نکاح متعہ کے جواز کا مسئلہ ہے، ذیل میں نکاح متعہ(۱) سے متعلق چند اہم نکات ملاحظہ فرمائیں:

اول: شیعہ اور اہل سنت سمیت تمام مسلمان فقہاء کا اتفاق ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے دور میں متعہ حلال و جائز اور مسلمانوں کے درمیان رائج تھا، اور اکثر صحابہ کرام جنگوں یا مسافرت وغیرہ کے دوران اس شرعی حکم پر عمل بھی کیا کرتے تھے۔

دوم: قرآن مجید میں متعہ کا حکم واضح طور پر موجود ہے: ﴿...وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ اِلا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ كِتَابَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَأُحِلَّ لَكُمْ مَاوَرَاءَ ذَلِكُمْ أَنْ تَبْتَغوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ فَمَااسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً وَلاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرَاضَيْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الفَرِيْضَةِ اِنَّ اللهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ ''...اور شوہر دار عورتیں (بھی تم پر حرام ہیں) یہ خدا کا تم پر واجب حکم ہے۔ اور ان عورتوں کے علاوہ باقی سب تمہارے لیے حلال ہیں کہ تم اپنے اموال (حق مہر) سے پاکدامن عورتوں کی خواستگاری کرو، نہ کہ

---

(۱) متعہ، نکاح کی ایک قسم ہے، جس میں باقاعدہ عقد نکاح پڑھا اور حق مہر معین کیا جاتا ہے، عام (دائمی) نکاح اور متعہ میں فرق یہ ہے کہ متعہ میں نکاح کی ایک مدت معین کی جاتی ہے اور مقررہ مدت پوری ہونے پر میاں بیوی کے درمیان خود بخود علیحدگی ہو جاتی ہے، نیز نکاح متعہ میں میاں بیوی کے درمیان میراث نہیں ہوتی، نکاح متعہ کے تفصیلی احکام جاننے کے لیے فقہ کی کتب مثلاً توضیح المسائل وغیرہ کی طرف رجوع کریں۔

زنا کاروں کی، البتہ جن عورتوں کے ساتھ تم نے متعہ کیا ہے تو انہیں مقرر کیا ہوا مہر دے دو اور اگر تم مہر معین کرنے کے بعد آپس میں (کمی وبیشی) پر راضی ہو جاؤ تو کوئی حرج نہیں بے شک اللہ واقف اور حکمت ومصلحت جاننے والا ہے''(۱)؛ جیسا کہ آیت مبارکہ: ﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثَلاثَ وَرُبَاعَ... ﴾(۲) میں دائمی نکاح کا حکم بیان ہوا ہے، اسی طرح آیت مبارکہ: ﴿وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ .... فَمِنْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِنْ فَتَيَاتِكُمُ ... ﴾(۳) میں کنیزوں کے ساتھ نکاح کا حکم بیان ہوا ہے۔

سوم: یہ کہنا کہ آیت متعہ، سورہ مومنون کی آیت: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُوْنَ اِلّا عَلٰى أَزْوَاجِهِمْ أَوْمَامَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْن ﴾(۴)؛ سے منسوخ ہو چکی ہے، دعوی بلا دلیل ہے، کیونکہ متعہ والی عورت بھی منکوحہ اور ازواج میں سے ہے پس وہ بھی مذکورہ آیت میں شامل ہے؛ اگر متعہ کا حکم مذکورہ آیت سے منسوخ ہو چکا تھا تو پھر جناب عمر نے متعہ کو حرام قرار دیتے وقت اس آیت کو دلیل کے طور پر بیان کرنے کی بجائے متعہ کی حرمت کو اپنی طرف نسبت دیتے ہوئے یہ کیوں کہا: **متعتان كانتا على عهد رسول الله وأنا أُحرّمهما وأعاقب عليهما** ''رسول خدا ﷺ کے زمانے میں دو طرح کا متعہ جائز تھا لیکن میں اسے حرام قرار دیتا ہوں اور ان (کی

---

(۱) سورہ نساء (۴) آیت ۲۴.

(۲)... پس عورتوں میں سے جو تمہیں اچھی لگیں اُن کے ساتھ نکاح کرو، دو دو اور تین تین اور چار چار، اور اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی پر اکتفا کرو (سورہ نساء (۴) آیت ۳).

(۳) اور تم میں سے جو کوئی عفت دار مومنہ عورتوں سے نکاح کرنے کی مالی حیثیت سے طاقت نہ رکھتا ہو تو وہ تمہاری اُن مومنہ کنیزوں سے نکاح کر سکتا ہے جو تمہارے قبضہ میں ہیں (سورہ نساء (۴) آیت ۲۵).

(۴) اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں سے یا اپنی لونڈیوں سے، تو اُن پر کوئی ملامت نہیں ہے (سورہ مومنون (۲۳) آیات ۵، ۶).

انجام دہی) پر سزا بھی دوں گا''؟!(۱)۔

اسی طرح اہل سنت کی معتبر کتب میں موجود روایات دلالت کرتی ہیں کہ **متعة الحج** اور **متعة النساء** کا حکم منسوخ نہیں ہوا تھا بلکہ جناب عمر نے اپنی مرضی سے انہیں ممنوع قرار دیا تھا، جیسا کہ اہل سنت کے امام بخاری نے روایت کی ہے: **عن عمران بن حصين، قال: نزلت آية المتعة في كتاب الله ففعلناها مع رسول الله ﷺ ولم ينزل قرآن يحرمه ولم ينه عنها حتى مات، قال الرجل برأيه ماشاء، قال محمد: يقال انّه عمر**؛ ''عمران بن حصین نے کہا: قرآن مجید میں متعہ کی آیت نازل ہوئی اور ہم نے رسول خدا ﷺ کے ساتھ مل کر (حج) تمتع کیا، اور قرآن میں متعہ کی حرمت کا حکم بھی نازل نہیں ہوا اور پیغمبر اکرم ﷺ نے بھی اس سے منع نہیں فرمایا یہاں تک کہ آپؐ وفات پا گئے، البتہ ایک شخص (جناب عمر) نے اپنی مرضی سے جو چاہا کہہ دیا، محمد نے بتایا: کہا جاتا ہے کہ وہ شخص عمر ہے''(۲)۔

چہارم: بعض مسلمان متعہ کو زنا سے تشبیہ دیتے ہیں جبکہ کوئی مسلمان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ پیغمبر اکرمؐ کے دور میں متعہ حلال تھا اور صحابہ کرامؓ اس پر عمل کیا کرتے تھے اگر فرض کر لیا جائے

---

(۱) **عن أبي نضرة عن جابر رضي الله عنه قال: قلت انّ ابن الزبير ينهى عن المتعة وانّ ابن عباس يأمر بها، قال على يدي جري الحديث تمتعنا مع رسول الله ﷺ ومع أبي بكر رضي الله عنه فلمّا ولي عمر خطب الناس، فقال: انّ رسول الله ﷺ هذا الرسول وانّ هذا القرآن هذا القرآن وأنّهما كانتا متعتان على عهد رسول الله ﷺ وأنا أنهى عنهما وأعاقب عليهما، احداهما متعة النساء ولا اقدر على رجل تزوج امرأة إلى اجل الا غيبته بالحجارة والاخرى متعة الحج** (السنن الكبرى (بيهقي): ج۷ص۲۰۶)؛ نیز فخر رازی نے بھی متعہ کی حرمت کیلئے جناب عمر کے اسی قول سے استدلال کیا ہے: (تفسیر مفاتیح الغیب، آیت متعہ کے ذیل میں)؛ پس جناب عمر کا متعہ کی حرمت کو اپنی طرف نسبت دینا اور اس عمل کے ارتکاب پر سزا کی دھمکی دینا اس بات کی دلیل ہے کہ متعہ کی حرمت نہ قرآن مجید سے ثابت ہے اور نہ ہی رسول خدا ﷺ نے اسے حرام کیا تھا۔

(۲) **صحيح بخاري، كتاب التفسير، قوله تعالى: فمن تمتع بالعمرة الى الحج، سوره البقرة.**

کہ متعہ سے منع کر دیا گیا تھا، جب بھی متعہ کو زنا کہنے والے افراد سے سوال ہے کہ: کیا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زنا جیسے حرام فعل کو حلال کیا تھا، اگر چہ کچھ دیر کیلئے ہی سہی؟!(۱)۔

پنجم: اہل سنت کی معتبر کتاب صحیح مسلم میں موجود روایت سے واضح ہوتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جناب ابوبکر کے دور میں صحابہ کرامؓ متعہ کے شرعی حکم پر عمل کیا کرتے تھے، جیسے جابر بن عبداللہ انصاری نے بیان کیا ہے: **کنّا نستمتع بالقبضة من التمر والدقيق الايام على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم و أبي بكر حتى نهى عنه عمر في شأن عمرو بن حريث** ''ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جناب ابوبکر کے دور میں مٹھی بھر کھجور اور آٹے کے عوض چند روز کے لئے متعہ کیا کرتے تھے یہاں تک کہ جناب عمر نے عمرو بن حریث کے واقعہ کے سلسلہ میں متعہ سے منع کر دیا''(۲)۔

مذکورہ روایت کے الفاظ ابتدائی الفاظ **کنّا نستمتع** ''ہم متعہ کیا کرتے تھے'' سے معلوم ہوتا ہے کہ متعہ کا عمل صحابہ کرامؓ کے درمیان رائج رہا ہے، اب متعہ کو زنا کہنے والوں سے سوال ہے کہ وہ متعہ کرنے والے صحابہ کرام کے بارے میں کیا فتوی دیں گے؟!

ششم: صحیح مسلم ہی میں روایت ہے: **قال عطا: قدم جابر بن عبدالله معتمراً فجئناه في**

---

(۱) عن جابر بن عبدالله قال: كنا نعمل بها (يعني متعة النساء) على عهد رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم وفي زمان أبي بكر وصدرًا من خلافة عمر حتى نهانا عنها ''جابر بن عبداللہ نے بیان کیا ہے: ہم رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں متعہ کے حکم پر عمل کرتے تھے، اسی طرح جناب ابوبکر کی خلافت کے دور میں بھی اور جناب عمر کی خلافت کے ابتدائی دور میں بھی متعہ کرتے تھے، یہاں تک کہ جناب عمر نے ہمیں متعہ سے روک دیا'' (سنن النسائی: ج۳ص ۳۲۶)؛ عن مسلم القري قال: دخلنا على أسماء ابنة أبي بكر فسألناها عن متعة النساء، فقالت: فعلناها على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم ''مسلم القری نے بیان کیا ہے: ہم جناب ابوبکر کی بیٹی اسماء کے پاس گئے اور اُس سے عورتوں کے ساتھ متعہ کے بارے میں دریافت کیا، اسماء نے کہا: ہم نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اس پر عمل کیا ہے'' (سنن النسائی: ج۳ ص ۳۲۶)

(۲) صحيح مسلم: كتاب النكاح، باب نكاح المتعة.

منزلہ فسأله القوم عن أشياء ثم ذكروا المتعة فقال: نعم، استمتعنا على عهد رسول اللہ و أبي بكر و عمر ثم نهى عنها عمر ''عطا نے بیان کیا ہے کہ جابر بن عبداللہ (عمرہ کا) احرام باندھے ہوئے آئے، تو ہم اُن کے گھر پہنچے اور کچھ افراد نے اُن سے چند چیزوں کے بارے پوچھا اور پھر متعہ کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت جابرؓ نے کہا: ہاں، ہم نے عہدِ رسالت، جناب ابوبکر اور عمر کے زمانے میں متعہ کیا لیکن پھر عمر نے اس سے منع کر دیا''(۱)۔

کیا اہل سنت کی معتبر کتب میں مذکور ایسی روایات متعہ کے جائز ہونے کی واضح دلیل نہیں ہے؟!

ہفتم: بعض اہل سنت علماء نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد بھی بعض عظیم صحابہ کرام متعہ کی حلّیت کے قائل رہے، چنانچہ ابن حزم، شوکانی اور ابن حجر وغیرہ نے بیان کیا ہے: ''رسول خدا ﷺ کی وفات کے بعد بھی سلف کی ایک جماعت عقد متعہ کو حلال جانتی تھی اُن میں صحابہ کرامؓ بھی شامل ہیں مثلاً اسماء بنت ابی بکر صدیق، جابر بن عبداللہ، ابن مسعود، ابن عباد، معاویہ بن ابی سفیان، عمرو بن حریث، ابوسعید خدری، سلمہ اور معبد بن امیہ بن خلف؛ نیز جابر بن عبداللہ نے تمام صحابہ سے روایت کی ہے کہ متعہ رسول خدا کے زمانے میں حلال تھا، پھر ابوبکر کے زمانے میں بھی اور پھر عمر کے دورِ خلافت کے تقریباً آخر تک حلال تھا''(۲)؛ اہل سنت علماء کا یہ قول بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ متعہ کی آیت منسوخ نہیں ہوئی اور نہ ہی رسول خدا ﷺ

---

(۱) صحيح مسلم: ج: كتاب النكاح، باب نكاح المتعة.

(۲) وقد ثبت على تحليلها (المتعة) بعد رسول الله ﷺ جماعة من السلف رضى الله عنهم منهم من الصحابة رضى الله عنهم أسماء بنت أبى بكر الصديق، وجابر بن عبد الله، وابن مسعود، وابن عباس، ومعاوية بن أبى سفيان، وعمرو بن حريث، وابو سعيد الخدرى، وسلمة، ومعبد ابناء أمية بن خلف، ورواه جابر بن عبد الله عن جميع الصحابة مدّة رسول الله ﷺ، ومدة أبى بكر، وعمر إلى قرب آخر خلافة عمر (المحلى (ابن حزم): ج۹ص۵۱۹؛ نیل الاوطار (شوکانی): ج۶ص۲۷۰؛ الاصابۃ (ابن حجر) ج۳ص۱۲۱، ذکر سلمۃ بن امیۃ).

نے متعہ کو حرام قرار دیا تھا، بلکہ متعہ کے جواز کا قائل ہونا گویا حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابن عباسؓ جیسے عظیم صحابہ کرام کی سنت ہے۔

ہشتم: اہل سنت کی معتبر روایات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سب سے پہلے جس نے متعہ کی حرمت کا حکم نافذ کیا وہ جناب عمر ہیں جبکہ قرآن مجید میں صراحت کے ساتھ متعہ کا حکم موجود ہے نیز نہ تو پیغمبر اکرم ﷺ نے متعہ سے منع فرمایا اور نہ ہی خلیفہ اول حضرت ابوبکر نے(۱)؛ چنانچہ احمد بن حنبل روایت کرتے ہیں: **عن جابر قال: متعتان كانتا على عهد النبي ﷺ فنهانا عنهما عمر رضي الله عنه فانتهينا** ''جابر بن عبداللہ نے بیان کیا ہے: دو متعہ (متعہ الحج اور متعہ النساء) رسول خدا ﷺ کے زمانہ میں تھے لیکن جناب عمر نے ہمیں ان سے منع کیا اور ہم رک گئے''(۲)؛ اسی طرح اہل سنت عالم ابن حجر نے بیان کیا ہے کہ ''سلمہ بن امیہ نے حکیم بن امیہ کی کنیز کے ساتھ متعہ کیا اور وہ حاملہ ہوگئی، جب جناب عمر بن خطاب کو اس بات کی خبر ہوئی تو انہوں نے متعہ کو ممنوع قرار دے دیا''(۳)۔ اس روایت سے بھی واضح ہوتا ہے کہ جناب عمر بن خطاب کی خلافت تک متعہ جائز رہا ہے، اس بنا پر متعہ کی ممنوعیت کو رسول خدا ﷺ کے ساتھ نسبت دینا صحیح نہیں ہے(۴)۔

---

(۱) پس جب قرآن مجید سے بھی متعہ کا جواز ثابت ہے اور رسول خدا ﷺ کے زمانے میں بھی متعہ جائز رہا ہے تو ہم اس شرعی حکم کو حرام نہیں کر سکتے کیونکہ اللہ تعالی کا واضح ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنزَلَ اللهُ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ﴾ ''جو لوگ خدا کی نازل کی ہوئی کتاب کے مطابق حکم نہ دیں تو وہی لوگ ظالم ہیں'' (مائدہ (۵) آیت ۴۵) اور فرمایا: ﴿...فَأُولَئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ﴾ ''...وہی لوگ فاسق ہیں'' (مائدہ (۵) آیت ۴۷)؛ اور فرمایا: ﴿...فَأُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ ''.....وہی لوگ کافر ہیں'' (مائدہ (۵) آیت ۴۴)۔

(۲) مسند (أحمدبن حنبل) ج۳: ۳۲۵، مسند جابر بن عبدالله.

(۳) الاصابة (ابن حجر) ج۸ص۸۸، ذكرسلمىٰ؛ ج۳ص۱۲۱ ذكر سلمة بن امية.

(۴) اہل سنت کی کتب میں موجود جن روایات میں متعہ کی ممنوعیت کو رسول خدا ﷺ کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے وہ بہت مختلف ہیں، بعض روایات کے مطابق فتح خیبر میں متعہ سے منع کیا گیا اور بعض روایات کے مطابق فتح مکہ کے موقع پر۔

نہم: بعض مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ متعہ کے جواز کا قائل ہونا گویا عورت کو مرد کے ہاتھوں کا کھلونا قرار دینا ہے جو کہ عورت پر ظلم ہے اور اس سے مرد ناجائز فائدہ اٹھا سکتا ہے، لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ متعہ میں بھی دائمی نکاح اور شادی کی طرح عورت کی رضایت شرط ہے چنانچہ وہ اس عمل کو اپنے اختیار سے قبول یا رد کرسکتی ہے لہذا متعہ بھی دائمی نکاح کی طرح ہے جس میں زبردستی نہیں ہے اور نہ ہی ناجائز فائدہ اٹھانے کا تصور کیا جا سکتا ہے؛ اور اس عمل میں جو مقاصد مرد کے لئے فرض کئے جا سکتے ہیں وہی مقاصد عورت کے لیے بھی فرض کرنا ممکن ہے، چنانچہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ نکاح متعہ کرنے والے مرد اور عورت میں سے کسی ایک کو دوسرے کا کھلونا شمار کیا جائے۔

اس کے علاوہ اگر عالم بشریت پر عام اور وسیع نظر ڈال کر سنجیدگی سے غور کریں تو واضح طور پر مشاہدہ کریں گے کہ انسانی معاشرہ کی جنسی خواہشات کی تکمیل کو دائمی نکاح میں محدود کرنا عملی طور پر ممکن نہیں ہے، آج تک مہذب دنیا کے کسی بھی ملک کی حکومت کسی بھی ذریعہ سے غیر قانونی وقتی ملاپ پر کنٹرول نہیں کرسکی بلکہ ہر ملک میں بہت سی جگہوں پر آشکار یا مخفیانہ صورت میں جنسی عمل انجام پاتا ہے، چنانچہ جو مذہب جنسی آمیزش کو دائمی نکاح اور شادی تک محدود کر کے مکمل طور پر زنا کا راستہ روکنا چاہے، تو اس کے لئے ناگزیر ہے کہ متعہ جیسے شرعی حکم کو خاص شرائط کے ساتھ قانون میں جگہ دے تا کہ زنا کے دنیاوی واخروی مفاسد ونقصانات سے بچا جا سکے؛ اسی اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت علیؑ نے فرمایا: اگر خلیفہ دوم نکاح متعہ کو ممنوع قرار نہ دیتے تو نہایت شقی اور بدبخت شخص کے علاوہ کوئی زنا نہ کرتا(۱)۔

---

(۱) لولا أن عمر نهى عن المتعة ما زنى الا شقي (جامع البيان (طبری): ج۵ ص ۱۹؛ عوالي اللئالي (ابن ابی جمهور احسائی): ج۲ ص ۱۲۵؛ تفسير القرطبی: ج۵ ص ۱۳۰)

سوال نمبر 17:

تقیّہ سے کیا مراد ہے نیز کیا اسلام میں تقیہ جائز ہے؟

تقیہ سے مراد یہ ہے کہ کسی شرعی ضرورت مثلاً عزت و ناموس کے خوف یا جان و مال کے خطرہ کے وقت، یا کسی اور اہم شرعی مصلحت کے حصول کی خاطر حق کو دل میں پوشیدہ رکھ کر زبان یا عمل کے ذریعہ سے خلافِ حق بات کا اظہار کیا جائے؛ تقیہ کے جواز کی دلیل کیلئے یہی کافی ہے کہ یہ ایک فطری عمل ہے جس پر ہر ضعیف و کمزور انسان اپنی جان و مال کی حفاظت کے لیے عمل کرتا ہے چاہے وہ کسی بھی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہو۔

چونکہ اسلام دین فطرت ہے لہذا یہ بات کیسے صحیح ہوسکتی ہے کہ اس میں انسان کے فطری حق کو سلب کر کے ایک فطری تقاضے کو حرام قرار دیا گیا ہو؟! اسی لیے اسلام میں تقیہ صرف جائز ہی نہیں بلکہ اس کی اہمیت پر بھی بہت زور دیا گیا ہے۔

اول: تقیہ کے جواز پر قرآن مجید کی کئی آیات دلالت کرتی ہیں:

۱: ﴿ مَنْ كَفَرَ بِاللهِ مِنْ بَعْدِ إِيْمَانِهِ إِلَّا مَنْ أُكْرِهَ وَقَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالإِيمَان... ﴾ ''اُس شخص کے علاوہ جو (کلمہ کفر پر) مجبور کیا جائے جبکہ اُس کا دل ایمان سے مطمئن ہو، جو شخص بھی ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرے بلکہ سینہ تان کر کفر کرے تو اُن پر خدا کا غضب ہے اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے''(۱)؛ تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ یہ آیت تقیہ کے جواز پر دلالت کرتی ہے

---

(۱) سورہ نحل (۱۶) :آیت ۱۰۶.

چنانچہ اس کی تفسیر میں بیان کیا گیا ہے کہ جب کفار نے حضرت عمارؓ اور اُن کے والدین (جناب یاسر اور سمیّہ) کو گرفتار کرلیا اور انہیں کفر پر مجبور کیا، حضرت عمارؓ کے والدین کے انکار پر اُنہیں قتل کردیا گیا لیکن حضرت عمّارؓ نے کفر کے کلمات کہہ کر اپنی جان بچالی اس پر بعض مسلمانوں نے کہا کہ عمار کافر ہوگیا ہے لیکن جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ملی تو آپؐ نے فرمایا: عمارؓ سر سے پاؤں تک ایمان سے لبریز ہے، اور پھر عمار روتے ہوئے پیغمبر اکرمؐ کے پاس آئے تو آپؐ نے پوچھا: **کیف تجد قلبک؟ قال: مطمئن بالایمان قال: ان عادوا لک فعد لھم بما قلت** ''اے عمار تمہارے دل (میں ایمان) کی کیا حالت ہے؟ کہا: میرا دل تو ایمان پر قائم ہے، آپؐ نے فرمایا: پس (کوئی بات نہیں) اگر کفار دوبارہ تمہیں کفر پر مجبور کریں تو دوبارہ یہی کلماتِ کفر کہہ دینا''(۱)۔

بعض اہل سنت علماء ومفسرین نے اسی روایت کو دلیل بناتے ہوئے جان ومال کی حفاظت کیلئے تقیہ کو جائز قرار دیا ہے جیسا کہ معروف اہل سنت مفسر قاضی بیضاوی نے اس واقعہ کے ذیل میں لکھا ہے: **وھو دلیل علی جواز التکلم بالکفر عند الاکرہ** ''یہ واقعہ مجبوری کے وقت کلمہ کفر کہنے کے جواز کی دلیل ہے''(۲)۔

۲: ﴿**وَقَالَ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَه...**﴾ ''آل فرعون میں سے ایک مومن مرد نے کہا جو اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھتا تھا...''(۳)۔

اس آیت میں اللہ تعالی نے آل فرعون کے اس شخص کو مومن کا خطاب دیا جو فرعون کے مظالم

---

(۱) المستدرک (حاکم): ج۲ ص۳۵۷، کتاب التفسیر؛ السنن (بیھقی): ج۸ص ۳۰۹، کتاب المرتد, باب المکرہ علی الردۃ؛ تفسیر بیضاوی: ج ۱ ص ۳۹۶؛ تفسیر کشاف: ج۲ ص ۳۴۵.

(۲) الدر المنثور (سیوطی): ج۲ ص ۱۶؛ فتح القدیر (شوکانی): ج ۱ ص ۲۲۲ تفسیر سورہ آل عمران: آیت: ۲۸.

(۳) سورہ مومن (۴۰): ۲۸.

کے خوف سے اپنے ایمان کو چھپائے ہوئے تھا، پس اللہ تعالی کا اُس کے فعل (کتمان ایمان اور اظہار کفر) کو تعریف کے ساتھ بیان کرنا اور اُسے مومن کا خطاب دینا، تقیہ کے جواز کی واضح دلیل ہے۔

۳: ﴿لَايَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقَاةً﴾(۱)،(۲)

''مومنین کیلئے ضروری ہے کہ وہ مومنین کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے تو اسے خدا سے کوئی سروکار نہیں ہے مگر جب تمہیں اُن سے خوف اور ڈر ہو''۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ کفار کی دوستی حرام ہے مگر جب اُن سے جان و مال کا خوف دامنگیر ہو تو پھر ان کی عداوت کو پوشیدہ رکھ کر بظاہر اُن سے رفاقت اور میل جول رکھنا جائز ہے، کیونکہ جو کچھ لوگوں کے دلوں میں ہے خداوند بہر حال اُسے جانتا ہے۔

صحیح بخاری میں سورہ آل عمران کی آیت ﴿إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً﴾ کے ذیل میں لفظ ''تُقاۃ'' کی تفسیر تقیہ کے ساتھ کی گئی ہے: ''الا ان تتقوا منهم تُقاة وهي تقية'' ''تقاۃ سے مراد تقیہ ہے'' اور اس کے بعد ذیل میں لکھا ہے: وقال الحسن التقية الى يوم القيامة ''حسن بصری نے کہا کہ تقیہ قیامت تک باقی ہے''(۴)۔

---

(۱) سورہ آل عمران (۳) : ۲۸.

(۲) قراء سبعہ میں سے یعقوب اور مفضل نے مذکورہ آیت میں لفظ (تقاۃ) کو ''تقية'' پڑھا ہے (زادالمسیر (ابن الجوزی) : ج۱ص۳۱۷؛ تفسیر بیضاوی: ج۱ص۱۱۲) نیز قتادہ اور ابو رجاء بھی اس لفظ کو ''تقية'' ہی پڑھتے تھے (تفسير الدرّ المنثور (سيوطی): ج۲ص۱۶).

(۳) كنز العمال (متقي هندي): ج۳ص۹۶، ح۵۶۲۵؛ ينابيع المودة (قندوزی): ج۲ص۸۴، ذكر ما في كنوز الحقائق.

دوم: تقیہ کی اہمیت کے پیش نظر اہل اسلام کی معتبر کتب میں بہت سی احادیث موجود ہیں لہذا جس طرح اہل تشیع کی کتب میں یہ حدیث موجود ہے کہ **لا دین لمن لا تقیة لہٗ** یعنی جو شخص ضرورت کے وقت بھی تقیہ نہ کرے وہ بے دین ہے'' اسی طرح مذکورہ حدیث اہل سنت کی بعض کتب میں بھی موجود ہے(۱)۔

سوم: تقیہ کو جھوٹ یا نفاق کا نام دیکر شیعوں پر اعتراض کرنے والے درحقیقت اس نکتہ سے غافل ہیں کہ جھوٹ اور تقیہ میں بہت بڑا فرق ہے: جھوٹ یا نفاق میں زبانی طور پر حق کا اقرار کیا جاتا ہے لیکن دل میں باطل اور بے دینی پوشیدہ ہوتی ہے جبکہ تقیہ میں صرف زبانی طور پر باطل کا اقرار ہوتا ہے لیکن دل میں ایمان پوشیدہ ہوتا ہے، اس بنا پر تقیہ کو جھوٹ یا نفاق کہنا غلط ہے۔

چہارم: تقیہ پر اعتراضات کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ اکثر اہل سنت تقیہ کے سلسلہ میں شیعوں کے صحیح عقیدہ سے واقف نہیں ہیں، چنانچہ اُن کا خیال ہے کہ شیعہ ہر وقت اور ہر جگہ تقیہ پر عمل کرنا واجب سمجھتے ہیں جبکہ شیعہ فقہاء کے مطابق تقیہ نہ ہر جگہ واجب ہے اور نہ ہی ہر جگہ جائز؛ اور اس کی اہم ترین شرط یہ ہے کہ تقیہ صرف انسان کی جان و مال یا عزت و ناموس کے خطرہ کے وقت، یا کسی اور اہم مصلحت کے حصول کی خاطر جائز ہے، اسی لیے شیعہ فقہا نے تقیہ کے شرعی احکام بیان کرتے ہوئے اسے بھی دوسرے افعال کی مانند احکام خمسہ میں تقسیم کیا ہے:

۱: واجب تقیہ: جب فوری طور پر نقصان سے بچنا ضروری ہو۔

۲: مستحب تقیہ: جب تقیہ نہ کرنے پر دوسرے شخص کی طرف سے آہستہ آہستہ نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الاکراہ، باب قول اللہ: الّا من اکرہ.

۳: مکروہ تقیہ: جہاں نقصان برداشت کرنا، تقیہ کرنے سے بہتر ہو، مثلاً کسی قوم کے سردار کا تقیہ کرنا اُس کے پیروکاروں میں شکوک وشبہات پیدا ہونے کا سبب بنے۔

۴: حرام تقیہ: جب تقیہ کرنا کسی دوسرے مومن کا خون بہنے اور اُس کی موت کا سبب بن رہا ہو۔

۵: تقیہ مباح: جب تقیہ کرنے اور نہ کرنے میں کوئی فرق نہ ہو اور انسان دونوں کے انجام دینے میں اختیار رکھتا ہو۔

پس شیعوں کے عقیدہ کے مطابق اگر چہ تقیہ ہر جگہ انجام نہیں دیا جا سکتا لیکن بہر حال یہ ایک شرعی عمل ہے جس پر ضرورت کے وقت عمل کیا جا سکتا ہے۔

سوال نمبر 18:

کیا یزید اور اُس جیسے دوسرے افراد پر لعنت نہیں کرنا چاہیے؟

کیا کسی فاسق و فاجر شخص پر لعنت نہیں کرنا چاہیے کیونکہ شاید اللہ تعالی ایسے افراد کو اپنی رحمت کے سبب بخش دے؟!

جواب: اس سوال کے جواب سے پہلے لعنت کا صحیح مفہوم بیان کرنا ضروری ہے:

لعنت، نفرین کی ایک قسم اور طرفین (حق و باطل) کے درمیان جدائی اور بیزاری کی علامت ہے، لہذا لعنت کو گالی گلوچ کرنے کا مترادف قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ کسی کافر و مشرک شخص کو بھی گالی گلوچ کرنا جائز نہیں ہے(۱)؛ جبکہ لعنت کرنا یقیناً جائز عمل ہے۔

البتہ کسی بھی شخص پر بلا وجہ لعنت کرنا یقیناً جائز نہیں ہے، کیونکہ صرف ایسے شخص پر لعنت کرنا جائز ہے جو لعنت کا مستحق ہو چاہے وہ ظاہری طور پر کسی بھی دنیاوی مقام و منصب کا مالک ہو؛ اور ہر شخص اپنے کردار و عمل کی وجہ سے لعنت کا مستحق بنتا ہے، البتہ یہ بات غلط اور بلا دلیل ہے کہ کسی بھی شخص پر لعنت نہیں کرنا چاہیے کیونکہ:

اول: ایسا نظریہ رکھنا قرآن کے مخالف ہے کیونکہ اللہ تعالی نے قرآن مجید میں ظالموں اور منافقوں پر واضح الفاظ میں لعنت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿أُولَئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ﴾

---

(۱) ﴿وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللهِ فَيَسُبُّوا اللهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ﴾ ''اور تم انہیں بھی کالی گلوچ نہ کرو جو اللہ کے علاوہ کسی اور کو پکارتے (اور عبادت کرتے) ہیں کہ وہ سوچے سمجھے بغیر صرف دشمنی میں اللہ کو بھی برا بھلا کہیں گے'' (سورہ انعام (۶) آیت ۱۰۸)۔

’’یہ وہ لوگ ہیں کہ جن پر اللہ کی لعنت ہے اور لعنت کرنے والوں کی لعنت‘‘(۱)؛ اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا: ﴿أُولَئِکَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللهِ وَالْمَلائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ﴾ ’’یہ وہی لوگ ہیں کہ جن پر اللہ، فرشتے اور تمام لوگوں کی لعنت ہے‘‘(۲)؛ اور فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ﴾ ’’وہ لوگ جو اللہ اور اسکے رسول کو اذیت دیتے ہیں، ان پر دنیا میں بھی اللہ کی لعنت ہے اور آخرت میں بھی‘‘(۳)۔

اسی طرح قرآن مجید میں ۲۰ سے زیادہ مرتبہ کچھ افراد(۴) اپنے کردار اور خاص صفات کی بنا پر اللہ تعالی، فرشتوں یا مومنین کی لعنت کے مستحق قرار دیئے گئے ہیں اور اُن پر لعنت کی گئی ہے اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ جو لعنت کا مستحق ہو اُس پر لعنت کرنا سنتِ الٰہی اور پسندیدہ اعمال میں سے ہے۔

دوم: اللہ تعالی نے قرآن مجید میں حضرت ابراہیمؑ اور آپؑ کے ساتھیوں کی مشرکوں کے ساتھ بیزاری کے اظہار کی ستائش کرتے ہوئے فرمایا: ﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللهِ وَحْدَهُ﴾ ’’تمہارے لئے بہترین نمونہ عمل ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں میں ہے جب انہوں نے اپنی قوم سے کہہ دیا کہ ہم تم سے

---

(۱) سورہ بقرۃ(۲) آیت ۱۵۹.

(۲) سورہ بقرۃ(۲) آیت ۱۶۱.

(۳) سورہ أحزاب(۳۳) آیت ۵۷.

(۴) ان میں شیطان (سورہ حجر آیت ۳۵ و ۷۸)، کافر (بقرہ/۱۶۱، احزاب/۶۴)، مشرک و منافق (فتح/۸، توبہ/۶۸)، زمین میں فساد کرنے والے (رعد/۲۵)، جھوٹ بولنے والے (آل عمران/۶۱)، یہودی اور حکم خدا کی نافرمانی کرنے والے (مائدہ/۷۸، نساء/۴۷)، حقیقت چھپانے والے (بقرہ/۱۵۹)، پاکدامن عورتوں پر الزام لگانے والے (نور/۲۳)، انبیاء کو اذیت دینے والے (احزاب/۵۷)، مومنین کا خون بہانے والے (نساء/۹۳)، اور جہنمی لوگ (اعراف/۳۸) شامل ہیں۔

اورتمہارے معبودوں سے بیزار ہیں، ہم نے تمہارا انکار کردیا ہے اور ہمارے تمہارے درمیان بغض اور عداوت بالکل واضح ہے یہاں تک کہ تم خدائے وحدہ لاشریک پر ایمان لے آؤ''(۱)۔

مذکورہ آیت میں مشرکین کے ساتھ بیزاری کے اظہار کی بنا پر حضرت ابراہیمؑ اور آپؑ کے ساتھیوں کی تعریف کی گئی ہے اور انہیں مومنین کے لیے اسوہ اور نمونہ قرار دیا گیا ہے۔

سوم: یزید اور اس جیسے دیگر افراد پر لعنت قرآن مجید کی واضح آیت سے بھی ثابت ہے، جیسا کہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُهِينًا﴾ ''یقیناً جو لوگ خدا اور اس کے رسول کو تکلیف پہنچاتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں خدا کی لعنت ہے اور خدا نے ان کے لئے رسوا کن عذاب مہیّا کر رکھا ہے''(۲)۔

نیز صحیح روایات کے مطابق رسول خداﷺ نے امام حسینؑ کے بارے میں فرمایا: حسين مِنّي وأنا مِن حسين ''حسین مجھ سے ہے اور میں حسین سے ہوں'' مذکورہ حدیث کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ جس نے امام حسینؑ کو تکلیف پہنچائی گویا اُس نے رسول خداﷺ کو تکلیف پہنچائی اور ایسے شخص پر دنیا و آخرت میں اللہ تعالی کی لعنت ہے، پس جس شخص پر خدا لعنت بھیج رہا ہو اُسے کوئی مسلمان لعنت سے کیسے بچا سکتا ہے؟!!!

اسی طرح اہل سنت علماء و محدثین نے روایت کی ہے کہ رسول خداﷺ نے حضرت فاطمہؑ سے فرمایا: انّ اللہ یرضی لرضاکِ ویغضب لغضبک (۳) ''(اے فاطمہ) یقیناً اللہ تعالی تیری رضایت سے راضی اور تیری ناراضگی پر ناراض ہوتا ہے''؛ اسی طرح رسول خداﷺ

---

(۱) سورہ ممتحنہ (۶۰) آیت ۴.

(۲) سورہ احزاب (۳۳): آیت ۵۷.

(۳) الاصابة (ابن حجر): ج۸ ص ۲۶۵؛ ینابیع المودة (قندوزی): ج ۲ ص ۵۸.

نے یہ بھی ارشاد فرمایا: فاطمة بضعة منّي فمن أغضبها أغضبني ''فاطمہ میرا ٹکڑا ہے، جس نے اُسے ناراض کیا اُس نے مجھے ناراض کیا''(۱)؛ پس جو شخص حضرت فاطمہ علیہا السلام کو ناراض کر کے اللہ تعالی اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناراضگی مول لے وہ لعنت کا حقدار کیسے نہیں بن سکتا؟!!!

چہارم: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے بھی یہ بات ثابت ہے کہ کسی بھی مستحقِ لعنت پر، لعنت کرنا جائز ہے کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان پر لعنت کی تھی جب وہ آپ کا مذاق اڑاتے ہوئے شعر پڑھتا تھا، تو پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللهم العنه بكلّ حرف ألف لعنة ''خدایا، اُس پر ہر ہر حرف کے بدلے میں ہزار ہزار لعنت بھیج''(۲)؛ پس اگر کسی مستحقِ لعنت پر لعنت کرنا صحیح نہ ہوتا تو کبھی سیّد الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس فعل کو انجام نہ دیتے۔

اسی طرح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے فرمان سے حکم عدولی کرنے والے اپنے بعض ساتھیوں پر بھی لعنت کی ہے، جیسا کہ اہل سنت کی معتبر تاریخی کتب میں مذکور ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی مبارک زندگی کے آخری ایام میں اسامہ کی قیادت میں ایک لشکر تیار کیا اور اپنے اصحاب کو اس لشکر میں شامل ہونے کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: لعن الله من تخلّف عن جيش اسامه ''خدا لعنت کرے اس شخص پر جو اسامہ کے لشکر میں جانے سے سرپیچی کرے''(۳)؛ جبکہ اہل سنت کے تمام مؤرخین اقرار کرتے ہیں کہ آپؐ کے کچھ نامور ساتھی اسامہ کے لشکر کے ساتھ نہ گئے(۴)، پس جو

---

(۱) صحیح بخاری: ج۴ص ۲۱۰، کتاب الفضائل.

(۲) شرح نهج البلاغه (ابن ابی الحدید): ج۶ ص ۲۹۱.

(۳) داستانِ جیش اسامہ بہت سی تاریخی کتب میں مذکور ہے، مثلا طبقات (ابن سعد): ج۲ ص ۴۱؛ تاریخ ابن عساکر: ج۲ص ۳۹۱؛ کنز العمال (متقی هندی): ج ۵ص ۳۱۲؛ تاریخ کامل (ابن اثیر): ج ۲ص ۱۲۹. تاریخ (طبری): ج۳ص ۱۸۸؛ شرح نهج البلاغه (ابن ابی الحدید): ج۳ص ۲۰.

(۴) تفصیل کے لئے رجوع کریں: کتاب ماجرای سقیفہ (محمد رضا مظفر): ص۱۵۱؛ البدایہ والنہایہ: ج۸ص۷۳۔

لوگ اس لشکر کے ساتھ نہ گئے وہ سب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لعنت میں شامل ہوئے۔

نیز بعض علماء نے مؤثق طور پر یہ روایت بھی ذکر کی ہے کہ ایک دن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوسفیان کو گدھے پر بیٹھے دیکھا جبکہ اُس کا بیٹا گدھے کی لگام تھامے ہوئے آگے آگے چل رہا تھا اور یزید اُسے ہانکتے ہوئے پیچھے پیچھے چل رہا تھا، تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''خدا لعنت کرے اس (گدھے پر) بیٹھے ہوئے شخص پر، اُس کی لجام تھام کر آگے چلنے والے پر اور اُسے ہانکنے والے پر''(۱)؛ اس سے واضح ہوتا ہے کہ کسی مستحقِ لعنت پر لعنت کرنا شرعاً جائز ہے اور اگر یہ کام جائز نہ ہوتا تو کبھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کام نہ کرتے اور جس پر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت کی ہو اس پر لعنت کرنا نہ صرف جائز بلکہ سنت اور ثواب کا کام بھی ہے۔

پنجم: لعنت کا ایک اہم فطری اثر یہ ہے کہ لعنت کرنے والے کا کردار و عمل آہستہ آہستہ لعنت کیے جانے والے (ملعون) کے کردار و عمل سے مختلف ہوتا جاتا ہے، چنانچہ اگر کوئی مسلمان حقیقی اسلام پر عمل کرنا چاہتا ہے تو اسکے لیے ضروری ہے کہ وہ اسلام کے دشمنوں اور منحرف افراد پر لعنت اور بیزاری اختیار کرے؛ کیونکہ لعنت کرنا سبب بنتا ہے کہ ملعون افراد کے افکار و نظریات، لعنت کرنے والوں کے افکار و نظریات سے مخلوط نہ ہونے پائیں، اس بنا پر کسی بھی مسلمان کے لئے اپنے خالص مذہبی اعتقادات کی حفاظت کے لیے اسلام دشمنوں پر لعنت کرنا بھی ضروری ہے۔

ششم: بہت سے اہل سنت علماء بھی یزید جیسے افراد پر لعنت کرنے کو جائز سمجھتے ہیں بلکہ بعض علماء

---

(۱) ...قول الرسول وقد رآه مقبلا على حمار، ومعاوية يقود به ويزيد ابنه يسوق به، لعن الله القائد والراكب والسائق (تاريخ طبری: ج۸ ص ۱۸۵، سنہ ۲۸۴ھ کے واقعات کے ضمن میں؛ شرح نهج البلاغه (ابن ابی الحديد): ج۱۵ ص ۱۷۵، ابن ابی الحدید نے کہا ہے: ورواه ثقات الامة ''اسے مؤثق علماء اسلام نے روایت کیا ہے'').

نے یزید پر لعنت کے جواز کے بارے میں مستقل کتب تحریر کی ہیں جیسے ابن جوزی نے اسی موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا نام **الردّ علی المتعصب العنید المنکر للعن یزید** ''یزید پر لعنت کا انکار کرنے والے متعصب وکینہ پرور شخص کی ردّ'' رکھا۔

ہفتم: اس سوال کا جواب ایک فارسی شاعر نے بہترین الفاظ میں دیا ہے:

ای کہ گوئی بر یزید وآل او لعنت مکن

زانکہ شاید حق تعالی کردہ باشد رحمتش

آنچہ بر آل نبی او کرد اگر بخشد خدا

ہم ببخشاید ترا گر کردہ باشی لعنتش

''یعنی تم جو کہتے ہو کہ یزید اور اس کی آل پر لعنت نہ کرو کیونکہ شاید اللہ تعالی اس پر اپنی رحمت کر دے اگر خدا وہ سب کچھ بخش دے کہ جو یزید نے آل نبی کے ساتھ کیا، پس اگر تم اس پر لعنت کرو تو خدا تجھے بھی بخش دے گا''

یقیناً اگر اللہ تعالی، یزید کے آل نبیؐ پر ظلم وستم، مدینہ پر فوج کشی کر کے اصحاب رسول اور تابعین کے قتل عام اور انکی بیٹیوں کی عصمت دری، خانہ کعبہ پر چڑھائی اور سنگ باری کرنے کے باوجود اُسے بخش سکتا ہے تو وہ یزید پر لعنت کرنے والے کو کیوں نہیں بخش سکتا؟!۔

سوال نمبر 19:

کیا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام صحابہ عادل ہیں؟

اول: اہل سنت قائل ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام صحابہ عادل ہیں، لیکن شیعوں کے عقیدہ کے مطابق (جو کہ قرآن وسنت سے مأخوذ ہے) پیغمبر اکرمؐ کی مصاحبت سے شرفیاب ہونے والے تمام افراد ایک جیسے نہیں تھے بلکہ مؤرخین نے بارہ ہزار سے زیادہ افراد کے نام اصحاب کی فہرست میں درج کیے ہیں جن کے درمیان مختلف طرح کے چہرے نظر آتے ہیں۔

قرآنی نکتہ نگاہ سے اصحاب کے مختلف گروہ ہیں: پہلا گروہ ایسے اصحاب پر مشتمل ہے کہ جن کی خدمات نے اسلام پھیلانے میں انتہائی مؤثر کردار ادا کیا وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اور آپؐ کی رحلت کے بعد بھی دین اسلام اور آپؐ کے اہل بیت علیہم السلام سے وفادار رہے، قرآن مجید کی آیات میں ایسے اصحاب کی مدح وثنا ہوئی ہے(۱)۔

اور دوسرا وہ گروہ ہے کہ جنہیں پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مصاحبت حاصل ہوئی مگر وہ اسلام پر اپنے عقیدہ میں پختہ نہیں تھے لہذا کبھی کبھار اُن سے غلطیاں سرزد ہوئیں، کبھی جنگ میں سستی دکھائی، کبھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اعتراض کیا اور کبھی آپؐ کی نافرمانی کے بھی مرتکب ہوئے(۲)۔

---

(۱) سورہ توبہ (۹) آیت ۱۰۰، سورہ فتح (۴۸) آیت ۱۸، ۲۹، سورہ حشر (۵۹) آیت ۸.

(۲) اہل سنت کی صحاح ستہ اور خاص طور پر صحیح بخاری میں ایسے اصحاب کے بہت سے واقعات درج ہیں: مثلا جنگ بدر میں مال غنیمت کی تقسیم کے وقت کچھ صحابہ نے حضورؐ پر اعتراض کیا؛ جنگ احد میں بہت سے صحابہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میدان جنگ میں تنہا چھوڑ کر فرار کر گئے جبکہ آپؐ انہیں بلاتے رہے؛ اسی طرح جب ایک جنگ میں حضورؐ نے اونٹ ذبح (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسی طرح تیسرا گروہ ایسے صحابہ پر مشتمل تھا جنہوں نے منافقت کا راستہ اپناتے ہوئے اپنے ذاتی مفادات کو پیش نظر رکھ کر اسلام قبول کیا، قرآن مجید میں بعض آیات کے ضمن میں ایسے افراد کی حقیقت کو نمایاں کیا گیا ہے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان سے محتاط رہنے کا حکم دیا گیا(۱)۔

دوم: تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں سے کچھ افراد ایسے منافق تھے کہ جنہوں نے مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ایجاد کرنے اور کفار و مشرکین کی مدد کیلئے مسجد بنائی لیکن اللہ تعالی نے اُسے مسجد ضرار کا نام دیتے ہوئے اپنے نبیؐ کو اصحاب کی اس سازش سے آگاہ فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مَسْجِدًا ضِرَارًا وَكُفْرًا وَتَفْرِيقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِينَ ...﴾(۲)۔

اس نکتہ کی طرف توجہ بھی ضروری ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں اکثر منافقین کا شمار بھی اصحاب میں ہوتا تھا اور عام لوگ بعض منافقین کو بھی صحابی ہی سمجھتے تھے جیسا کہ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق جب جناب عمر نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے اجازت دیں کہ میں اس منافق (یعنی عبداللہ بن اُبی) کی گردن اڑا دوں تو پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: اُسے چھوڑ دو، کہیں لوگ یہ نہ کہیں کہ محمدؐ اپنے اصحاب کو بھی قتل کروا دیتا ہے(۳)۔

(پچھلے صفحہ سے بقیہ حاشیہ) کرنے کا حکم دیا تو کئی صحابہ نے آپؐ کی مخالفت کی؛ نیز صلح حدیبیہ کے وقت بھی بعض صحابہ نے آپؐ پر اعتراض کیا یہاں تک کہ آپؐ کی رسالت میں شک کیا؛ اسی طرح جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسامہ بن زید کو لشکر اسلام کا سردار بنایا تو کئی صحابہ نے مخالفت کی؛ اسی طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے وقت جب آپؐ نے کاغذ و قلم کا مطالبہ کیا تو بھی کچھ صحابہ نے آپؐ کی بات ماننے سے انکار کیا۔

(۱) سورہ منافقون(۶۳) آیہ ۱، توبہ(۹) آیہ ۱۰۱، ۱۰۲، سورہ احزاب(۳۳) آیہ ۱۲، حجرات(۴۹) آیہ ۶.

(۲) سورہ توبہ(۹) آیہ ۱۰۷.

(۳) ... فقال عمر بن خطاب رضی الله عنه: دعني يارسول الله أضرب عنق هذا المنافق، قال النبي صلی اللہ علیہ وسلم: دعه لايتحدث الناس أنّ محمدا يقتل اصحابه(صحيح بخاری، كتاب التفسير، تفسير سوره منافقين، يقولون لئن رجعنا الى...)

سوم: اہل سنت کی معتبر کتب میں موجود روایات سے بھی عدالت صحابہ کے نظریہ کی تردید ہوتی ہے: جیسے ابوھریرہ کا بیان ہے کہ رسول خداﷺ نے فرمایا: **یَرِد علیّ یوم القیامة رھط من أصحابي فیحلون عن الحوض، فأقول: یاربّ اصحابي، فیقول: انّک لاعلم لک بما أحدثوا بعدک انّھم ارتدّوا علی أدبارھم القھقری**؛ ''قیامت کے دن میرے اصحاب کا ایک گروہ میرے پاس آئے گا اور انھیں حوض کوثر سے دور کردیا جائے گا، تو میں کہوں گا: اے پروردگار! یہ میرے اصحاب ہیں؟ کہا جائے گا: تمہیں نہیں معلوم کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا کیا ہے، یقیناً یہ مرتد ہوگئے اور (اپنے سابقہ دین کی طرف) پلٹ گئے تھے''(۱)؛ اسی مضمون کی کئی دیگر روایات بھی صحیح بخاری میں موجود ہیں(۲)؛ جیسا کہ صحیح مسلم میں پیغمبر اکرمﷺ کی یہ حدیث موجود ہے: **في أصحابي اثناعشر منافقاً، فمنھم ثمانیة لایدخلون الجنّة حتی یلج الجمل في سمّ الخیاط** (۳) ''میرے اصحاب میں سے بارہ افراد منافق ہیں اور ان میں سے آٹھ افراد کا جنت میں داخل ہونا محال ہے''؛ لہذا اہل سنت کی معتبر کتب میں موجود اس طرح کی روایات واضح طور پر تمام صحابہ کی عدالت کے نظریہ کو ردّ کرتی ہیں۔

چہارم: علماء اور مورخین نے واضح طور پر بیان کیا ہے کہ معاویہ، عمرو عاص اور ان کے نمائندے، حضرت علیؑ پر طویل عرصہ تک لعنت اور سبّ وشتم کرتے رہے(۴)؛ تو کیا اس قبیح عمل کے باوجود

---

(۱) صحیح بخاری: کتاب الرقاق، باب الحوض.

(۲) ''انّ اناسا من أصحابي یؤخذ بھم ذات الشمال، فأقول أصحابي أصحابي، فیقول انّھم لم یزالوا مرتدین علی أعقابھم منذ فارقتھم (کتاب أحادیث الانبیاء، باب واتخذ اللہ ابرھیم...)؛ ''... فیقال: لاتدري ماأحدثوا بعدک (بخاری: کتاب تفسیر سورہ انبیاء)

(۳) صحیح مسلم: ج۸ص۲۲۱، کتاب صفات المنافقین، ط دارالفکر بیروت؛ السنن (بیھقی) کتاب المرتد، باب من یحرم۔

(۴) صحیح (مسلم) باب فضائل علیؑ؛ تاریخ (طبری): ۵۱ھجری کے واقعات؛ اسد الغابہ (ابن اثیر).

اُن سب کو عادل قرار دیا جاسکتا ہے؟!

پنجم: اہل سنت کی معتبر کتب کے مطابق صحابہ کرام، خود ایک دوسرے سے جھگڑتے اور یہاں تک کہ ایک دوسرے کو ڈنڈے اور جوتے بھی مارتے تھے(۱)؛ اسی طرح صحیح مسلم کی روایت کے مطابق بعض صحابی کبھی کبھار دوسرے بعض صحابی کو گالی گلوچ بھی کرلیا کرتے تھے: **کان بین خالد بن الولید وبین عبدالرحمن بن عوف شیء فسبّه خالد** ''خالد اور عبدالرحمٰن بن عوف کے درمیان کوئی مسئلہ تھا کہ جس کی بناء پر خالد نے عبدالرحمٰن کو گالی دی''(۲)؛ پس ایسی روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا تمام صحابہ کی عدالت کا نظریہ قبول کیا جاسکتا ہے؟!!!۔

ششم: اہل سنت کی معتبر کتب کے مطابق اصحاب میں سے کچھ ایسے افراد بھی تھے جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مرتد ہوگئے تھے جیسا کہ صحیح بخاری شریف میں ذکر کیا گیا ہے: **عن النبي صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم... أوّل من یکسی یوم القیامة ابراهیم، وانّ أناسا من أصحابي یؤخذ بهم ذات الشمال، فأقول أصحابي أصحابي، فیقال: انّهم لم یزالوا مرتدّین علی أعقابهم منذ فارقتهم...**؛ ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:...قیامت کے دن سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کو لباس پہنایا جائیگا، اور پھر میرے اصحاب میں سے کچھ افراد کو بائیں طرف سے لایا جائے گا، میں کہوں گا: یہ میرے اصحاب ہیں، یہ میرے اصحاب ہیں، اُسوقت کہا جائے گا: یہ لوگ آپؐ کے رحلت کے بعد فورا مرتد ہوگئے تھے''(۳)۔

---

(۱) ...**فقال رجل من الانصار منهم، والله لحمار رسول الله صلی الله علیه وسلم أطیب ریحاً منک، فغضب لعبدالله رجل من قومه فشتما فغضب لکل واحد منهما اصحابه فکان بینهما ضرب بالجرید والنعال والایدي** ...(صحیح (بخاری) کتاب الصلح؛ صحیح (مسلم) کتاب الجهاد، باب دعاء النبیؐ).

(۲) **صحیح مسلم: کتاب فضائل الصحابة، باب تحریم سب الصحابة.**

(۳) **صحیح بخاری: کتاب(احادیث) الانبیاء،باب قول الله واتخذ الله ابراهیم خلیلا.**

مذکورہ حدیث میں بعض صحابہ کو اصحاب الشمال کہا گیا ہے جبکہ قرآن مجید کا ارشاد ہے: ﴿وَأَصْحَابُ الشِّمَالِ مَا أَصْحَابُ الشِّمَالِ فِي سَمُومٍ وَحَمِيمٍ وَظِلٍّ مِنْ يَحْمُومٍ لَا بَارِدٍ وَلَا كَرِيمٍ﴾ ''اور بائیں ہاتھ والے، افسوس بائیں ہاتھ والے کیا (مصیبت میں) ہیں، وہ (دوزخ کی) لَو اور کھولتے ہوئے پانی اور کالے سیاہ دھوئیں کے سایہ میں ہوں گے جو نہ ٹھنڈا ہے اور نہ خوش آیند'' (۱)۔

ہفتم: قرآن مجید میں بھی اللہ تعالی نے سوالیہ اور تعجب کے لہجہ میں رسول خدا ﷺ کی رحلت کے بعد کچھ صحابہ کے مرتد ہونے کی خبر دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِيْن مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللهَ شَيْئًا﴾ (۲)

''اور محمد تو صرف ایک رسول ہیں جن سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں، کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم اُلٹے پیروں پلٹ جاؤ گے؟! تو جو بھی ایسا کرے گا وہ خدا کا کوئی نقصان نہیں کرے گا'' (۳)۔

---

(۱) سورہ واقعہ (۵۶) آیت ۴۱ تا ۴۴۔

(۲) سورہ آل عمران (۳) آیت: ۱۴۴

(۳) اسی آیت کے پیش نظر اہل سنت مفسر زمخشری کہتے ہیں: و روي انّه لمّا صرخ الصارخ قال بعض المسلمين ليت عبدالله بن ابي يأخذ لنا أماناً من أبي سفيان و قال ناسٌ من المنافقين لو كان نبيّاً لما قتل ارجعوا الى اخوانكم و الى دينكم ''روایت کی گئی ہے کہ جب (رسول اکرم ﷺ کے قتل کی) آواز بلند ہوئی تو بعض مسلمانوں (صحابہ) نے کہا: کاش عبداللہ بن ابی ہمارے لیے ابوسفیان سے امان نامہ لے لیتا اور بعض منافق لوگوں نے کہا: اگر (محمدؐ) نبی ہوتے تو قتل نہ ہوتے، لہذا اپنے بھائیوں کے دین کو ہی اختیار کر لو (یعنی کفر کی طرف پلٹ جاؤ)'' (الکشاف (زمخشری) ج ۱ ص ۴۲۲، ۴۲۳؛ طبع سوم، دار الکتاب العربی، سنہ ۱۴۰۷ھ؛ ۱۹۸۷ء.)

ہشتم: تمام صحابہ کو عادل اور قابل احترام قرار دینے والے اہل سنت اپنے اس نظریہ کی دلیل کے طور پر سورہ فتح کی آیت پیش کرتے ہیں جس میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿ لَقَدْ رَضِيَ اللهُ عَنْ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا ﴾ ''یقیناً خدا صاحبانِ ایمان سے اس وقت راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے پھر اس نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو ان کے دلوں میں تھا تو ان پر سکون نازل کر دیا اور انہیں اس کے عوض عنقریب فتح عنایت کر دی'' (۱)۔

اسی آیت کی بنا پر اہل سنت تمام صحابہ کو رضی اللہ کہہ کر پکارتے اور سب کو قابل احترام سمجھتے ہیں جبکہ **اولاً:** مذکورہ آیت سے صحابہ کے بیعت کرنے کے عمل کی تائید ہوتی ہے، نہ کہ ان کی زندگی کے تمام اعمال کی؛ اسی لیے آنحضرتؐ نے فرمایا: **أنتم اليوم خير أهل الارض** ''آج تم (بیعت کرنے کی بنا پر) بہترین اہل زمین ہو'' (۲)۔

ثانیاً: بیعت شجرہ کے وقت تمام صحابہ وہاں موجود ہی نہیں تھے بلکہ وہاں صرف ۱۳۰۰ یا ۱۴۰۰ یا ۱۵۲۵ فرد موجود تھے (۳)، لہذا مذکورہ آیت تمام صحابہ کی عدالت اور سب کے ساتھ اللہ تعالی کی رضایت کی دلیل نہیں بن سکتی۔

پس اس سے واضح ہوا کہ تمام صحابہ کی عدالت کا نظریہ قرآن وسنت کے مخالف ہے (۴)۔

---

(۱) سورہ فتح (۴۸) آیت ۱۸

(۲) الکشاف (زمخشری): ج ۴ ص ۳۴۰، ۴۲۳؛ طبع سوم، دار الکتاب العربی، سنہ ۱۴۰۷ھ؛ ۱۹۸۷ء۔

(۳) حوالہ سابق

(۴) مزید تفصیل کیلئے ہماری کتاب ''نظریہ عدالت صحابہ قرآن وسنت کی روشنی میں'' کا مطالعہ فرمائیں۔

سوال نمبر 20:

کیا شیعہ، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کی توہین کرتے ہیں؟

شیعوں کے حوالے سے اہل سنت کے درمیان ایک مشہور ترین غلط فہمی یہ ہے کہ شیعہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام کو نہیں مانتے یا اُن کی عظمت تسلیم نہیں کرتے، اس غلط فہمی کے ازالہ اور صحابہ کرام کے احترام کے حوالے سے شیعہ نکتہ نظر کو سمجھنے کیلئے چند نکات کی طرف توجہ ضروری ہے۔

اول: شیعہ، ایسے تمام صحابہ کی عظمت کے قائل ہیں کہ جنہوں نے حقیقی ایمان کے ساتھ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمنشینی اختیار کی اور آپؐ کے بعد بھی ایمان پر ثابت قدم رہے۔

کیا صحابہ میں حضرت علیؑ، حضرت ابن عباس، حضرت ابوذر، حضرت مقداد اور حضرت عمار یاسر وغیرہ کا شمار نہیں ہوتا؟!!! اور کیا کوئی انصاف پسند مسلمان یہ دعوی کرسکتا ہے کہ شیعہ، مذکورہ اصحاب اور ان جیسے دیگر صحابہ کرام کی عظمت کے قائل نہیں ہیں؟!!!

دوم: شیعوں پر توہین صحابہ کے الزام کا اصل سبب عدالت صحابہ کا نظریہ ہے یعنی اہل سنت تمام صحابہ کو عادل مانتے ہیں جبکہ شیعہ قرآن وحدیث کی بنا پر تمام صحابہ کی عدالت کے نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے اور گذشتہ سوال کے جواب میں بیان ہو چکا ہے کہ تمام صحابہ کی عدالت کا نظریہ قرآن وسنت کے مخالف ہے۔

سوم: اس مسئلہ میں اس اہم نکتہ کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے کہ توہین صحابہ کی بنیاد رکھنے والے افراد کون ہیں اور یہ قبیح عمل کن افراد کی سنت قرار پایا؟ جبکہ یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ شیعہ علماء کسی بھی صحابی بلکہ کسی عام فرد کو بھی گالی گلوچ کرنے کو جائز قرار نہیں دیتے، اہل سنت کی معتبر کتاب صحیح

مسلم میں سعد بن ابی وقاص کے بیٹے عامر سے روایت ہے: ''معاویہ نے سعد بن ابی وقاص کو حکم دیا، اور (جب سعد نے معاویہ کے حکم کی اطاعت سے پرہیز کی تو معاویہ نے سعد سے) پوچھا: تم حضرت علیؑ پر سَب (گالی گلوچ) کیوں نہیں کرتے؟ سعد نے جواب دیا: چونکہ مجھے تین باتیں یاد ہیں جو رسول خداﷺ نے حضرت علیؑ کے بارے میں بیان فرمائی، لہذا میں ہرگز اُن پر سَب نہیں کروں گا''(۱)۔ مسلمانوں کی صحیح ترین کتاب میں مذکور یہ روایت اہل تشیع کو توہین صحابہ کو مجرم قرار دینے والوں کیلئے لمحہ فکریہ ہے، اور ایسی ہی روایات کی بنا پر مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ حاکمِ شام معاویہ بن ابوسفیان نے حضرت علیؑ پر سَب (گالیاں دینا اور برا بھلا کہنا) ولعن کرنے کو معمول بنالیا تھا بلکہ خطباء کو حکم دیا کہ وہ جمعہ کے خطبہ میں منبروں سے حضرت علیؑ پر سَب ولعن سے کریں(۲)، اور

---

(۱) عن عامر بن سعد بن ابی وقاص عن ابیه قال امر معاویة بن ابی سفیان سعدا فقال ما منعک ان تسب ابا التراب فقال اما ما ذکرت ثلاثا قالهنّ له رسول الله صلی الله علیه وسلم فلن أسبّه لان تکون لي واحدة منهن أحبّ إليّ من حمر النعم...(صحیح مسلم: ج۷ص ۱۲۰، کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل علی؛ المستدرک (حاکم نیشاپوری): ج۳ص ۱۰۸، ناشر دارالمعرفة بیروت ۱۴۰۶) مذکورہ روایت کا انداز اور معاویہ کا جناب سعد سے حضرت علیؑ پر سَب کرنے کے بارے میں باز پرس کرنا صاف بتا رہا ہے کہ معاویہ کی طرف سے خلوت وجلوت میں یہ رسم عام ہو چکی تھی اور چونکہ حضرت سعد کا اس ڈگر پر نہ چلنا معاویہ کی رسم اور معمول کے خلاف تھا جس پر معاویہ کو تشویش ہوئی اور اُس نے جناب سعد بن ابی وقاص سے باز پرس کی۔

(۲) ابن ابی الحدید اس بارے میں کہتے ہیں: ان معاوية أمر الناس بالعراق والشام وغيرهما بسبّ علي عليه السلام والبرائة منه، وخطب بذلک علی منابر الاسلام وصار ذلک سنّة في أيام بني اميّه الی أن قام عمر بن عبدالعزيز رضي الله عنه فأزاله، وذکر شيخنا أبوعثمان الجاحظ أنّ معاوية کان يقول في آخر خطبة الجمعة: اللهم انّ أباتراب ألحد في دينک وصدّ عن سبيلک فالعنه لعناً وبيلاً وعذّبه عذاباً أليماً، وکتب بذلک الی الآفاق، فکانت هذه الکلمات يشاربها علی المنابر الی خلافة عمر بن عبدالعزيز. (شرح نهج البلاغه: ج۴ص ۵۶، ناشر دار احياء الکتب العربية).

اُس کی یہ سنت سیئہ ستر سال تک (عمر بن عبدالعزیز کے دوران حکومت ۹۹ تا ۱۰۲ ہجری تک) تمام مملکت اسلامیہ میں جاری رہی، اس تلخ تاریخی حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے شیعوں پر توہین صحابہ کا فتوی لگانے والے مفتی، ابوسفیان کے بیٹے جناب معاویہ کے بارے میں کیا فتوی دیں گے؟!(۱)۔

اگر جناب معاویہ کے اس عمل کی اجتہاد کے ذریعہ تاویل کرنے کی کوشش کی جائے تو جواباً کہا جا سکتا ہے کہ اجتہاد مسلمانوں کے کسی خاص گروہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، پس اگر اجتہاد کی بنیاد پر حضرت علیؑ جیسی شخصیت پر سَب ولعن کرنا جائز ہوسکتا ہے جو علم وتقویٰ، فضل وزہد میں سب سے زیادہ نمایاں، پیغمبر اکرمؐ کے چچازاد بھائی، آپؐ کے داماد اور دین کی تبلیغ میں آپؐ کے ناصر ومددگار تھے، تو پھر ایسا ہی اجتہاد کر کے کوئی مسلمان کسی عام صحابی کے بارے میں اپنے نظریہ کا اظہار کیوں نہیں کرسکتا؟! نیز اہل سنت کے اسی معیار کے مطابق اگر فرض کریں کہ کچھ اہل تشیع کا بعض اصحاب کے بارے میں اجتہاد صحیح نہ ہو جب بھی وہ گنہگار نہیں ہوں گے۔

---

(۱) اہل سنت کی معتبر کتب میں روایت ہے: قدم معاوية في بعض حجاته فدخل عليه سعدٌ، فذكروا علياً، فنال منه [معاوية]؛ فغضب سعدٌ وقال: تقول هذا لرجل سمعت رسول الله صلى الله عليه و سلم يقول: "من كنت مولاه فعلي مولاه" وسمعته يقول: "أنت منّي بمنزلة هارون من موسى إلا أنّه لا نبيّ بعدي" وسمعته يقول: "لأعطين الراية اليوم رجلا يحب الله ورسوله"؟! "حج پر جاتے ہوئے سعد بن ابی وقاص کی ملاقات معاویہ سے ہوئی اور جب کچھ لوگوں نے حضرت علیؑ کا ذکر کیا تو اس پر معاویہ نے حضرت علیؑ کی بدگوئی کی، اس پر سعد بن ابی وقاص غضبناک ہوگئے اور کہا: کہ تم علیؑ کے متعلق ایسا کہتے ہو؟! جبکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ "جس جس کا میں مولی ہوں اُس اُس کا یہ علیؑ مولی ہے، اور میں نے یہ بھی سنا کہ آپؐ نے فرمایا: "اے علیؑ آپکو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی سوائے یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا، اور میں نے (رسول خدا ﷺ سے) یہ بھی سنا ہے کہ فرمایا: کل میں علم ایسے شخص کو دوں گا جو اللہ اور اور اسکے رسول سے محبت کرتا ہے (سنن ابن ماجه: ج ۱ ص ۴۵، باب فضل علی بن ابی طالب، طبع دار الفكر ؛ المصنف (ابن ابی شيبة)، كتاب الفضائل، طبع اول ۱۴۰۹ھ، دار الفكر بيروت).

چہارم: اہل سنت کی بعض معتبر کتب کے مطابق جناب عایشہ، عام لوگوں کو خلیفہ سوم کے خلاف بھڑکاتی اور کہتی تھیں: **اقتلوا نعثلاً فقد کفر** ''بوڑھے یہودی کو قتل کردو، یہ کافر ہوگیا ہے''(۱)، جبکہ کوئی مسلمان جناب عائشہ کے اس قول کو توہین صحابی قرار نہیں دے سکتا کیونکہ یہ اُن کا ذاتی نظریہ تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی صحابی کے بارے میں اپنا خاص نظریہ بیان کرنا جرم نہیں ہے۔

پنجم: اگر صحابہ کے بارے میں نقل شدہ روایات بیان کرنے سے صحابہ کی توہین لازم آتی ہے تو اہل سنت کی معتبر کتب مثلاً صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ کے بارے میں کیا فیصلہ ہے کہ جن میں ایسی بہت سی روایات نقل ہوئی ہیں جنہیں اہل سنت، صحابہ کی توہین قرار دیتے ہیں(۲)۔

ششم: اہل سنت کی معتبر کتب کے مطابق حضرت علی علیہ السلام اور پیغمبر اکرمؐ کے چچا جناب عباس بن عبد المطلبؓ بعض صحابہ کو جھوٹا، گناہ کار، دھوکے باز اور خائن سمجھتے تھے(۳)، تو کیا کوئی مسلمان حضرت علیؑ اور حضرت عباس بن عبد المطلب کو توہین صحابہ کا مجرم قرار دے سکتا ہے؟!!!؛

اگر ایسا ہرگز ممکن نہیں ہے تو پھر اگر کوئی مسلمان بعض صحابہ کے بارے میں حضرت علیؑ اور حضرت عباس بن عبد المطلب کا عقیدہ اپنائے تو اُسے توہین صحابہ کا مجرم کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟!!! جبکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کو حق کے ساتھ اور حق کو حضرت علیؑ کے ساتھ قرار دیا ہے۔

ہفتم: صحابہ کے مسئلہ میں بعض مسلمان نہایت حساس ہیں، اور وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر صحابہ کی عصمت کے قائل ہیں جبکہ اگر شیعہ اہل بیت علیہم السلام کی عصمت کے عقیدہ کو بیان کریں تو یہی لوگ شیعوں پر اعتراضات کی بوچھاڑ بھی کرنے لگتے ہیں۔

---

(۱) تاریخ (طبری): ج ۲، سنہ ۳۶ ہجری کے واقعات؛ شرح نهج البلاغة (ابن ابی الحدید): ج ۲ ص ۷۷.

(۲) جیسا کہ گذشتہ سوال کے جواب میں اہل سنت کی معتبر کتب سے کچھ روایات بطور نمونہ ذکر کی گئی ہیں۔

(۳) اس بارے میں سوال نمبر 4 کے جواب کے ضمن میں روایت کا ذکر گزر چکا ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

سوال نمبر 21:

کیا امام حسینؑ کے غم میں نوحہ و ماتم ناجائز اور حرام ہے؟

اول: کسی بھی مصیبت اور غم میں رونا یا نوحہ و ماتم کرنا ایک فطری عمل ہے، اور چونکہ دین اسلام فطرت کے عین مطابق ہے(۱)، لہذا شریعت میں باقی فطری اعمال کی طرح مصیبت کے وقت رونے اور ماتم کرنے سے بھی منع نہیں کیا گیا۔

دوم: قرآن مجید میں واضح طور پر حضرت یوسفؑ کی جدائی کے غم میں حضرت یعقوبؑ کے گریہ وعزاداری کو بیان کیا گیا ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿یَا أَسَفَى عَلَى يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيمٌ﴾ ''اور یعقوب نے (روتے ہوئے) کہا: ہائے افسوس یوسف پر، اور (اسقدر روئے کہ) ان کی آنکھیں صدمہ سے سفید ہوگئیں اور وہ رنج کے بڑے ضبط کرنے والے تھے''(۲)؛ حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ دونوں نبی تھے اور حضرت یعقوبؑ کا گریہ وعزاداری صرف باپ ہونے کی بناء پر نہ تھی بلکہ درحقیقت ایک پیغمبر، دوسرے پیغمبر کے غمِ فراق میں گریہ کر رہا تھا اور چونکہ قرآن مجید میں مذکور ہر داستان، کچھ اہم نکات و پیغامات پر مشتمل ہے لہذا ظاہری طور پر مذکورہ آیت کا اہم ترین پیغام یہی ہے کہ جس شخصیت کے ساتھ کوئی دینی والہی تعلق ہو اس کی مصیبت یا مفارقت کے غم میں رونا نہ صرف جائز بلکہ اللہ تعالی کی رضایت وخوشنودی کا سبب ہے۔

---

(۱) ﴿فِطْرَةَ اللهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لاتَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللهِ﴾. (سورہ روم(۳۰) : آیت ۳۰).

(۲) سورہ یوسف(۱۲) : آیت ۸۴

پس حضرت یعقوبؑ کے اس عمل سے، خداوند کے اولیاء پر گریہ کرنے کا جواز ثابت ہوتا ہے، شاید اسی لیے کربلا کے بعد جب کوئی شخص امام زین العابدینؑ سے گریہ کے بارے سوال کرتا تو امامؑ، حضرت یعقوبؑ کے گریہ کا حوالہ دیتے تھے(۱)۔

نیز حضرت یعقوبؑ کے اس عمل سے صرف رونے کا جواز ہی ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ کسی شرعی مقصد کے تحت کوئی ایسا عمل کرنا بھی جائز ہے جس سے انسان کے کسی عضو کو نقصان پہنچ جائے کیونکہ حضرت یعقوبؑ اپنے بیٹے کے غم میں نہ صرف روئے بلکہ اتنا روئے کہ آپؑ کی آنکھیں سفید ہوگئیں اور آپؑ نابینا ہوگئے، یہاں تک کہ حضرت یوسفؑ کے بھائی سمجھنے لگے کہ یعقوبؑ اس غم سے شدید بیمار ہوجائیں گے اور یا مرجائیں گے: ﴿قَالُوا تَاللهِ تَفْتَأُ تَذْكُرُ يُوسُفَ حَتَّى تَكُونَ حَرَضًا أَوْ تَكُونَ مِنَ الْهَالِكِينَ﴾(۲) ''انہوں نے کہا: خدا کی قسم آپ برابر یوسف کو یاد کرتے رہیں گے یہاں تک کہ سخت بیمار پڑ جائیں یا ہلاک ہوجائیں''۔

سوم: اہل سنت کی معتبر کتب کے مطابق رسول خداﷺ اپنے فرزند حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے وقت روئے اور گریہ کیا: **عن أنس، قال: رأيت ابراهيم بين يدى رسول اللهﷺ يكيد بنفسه فدمعت عينا رسول اللهﷺ وقال تدمع العين ويحزن القلب**؛ ''انس بیان کرتے ہیں کہ میں نے دیکھا جب رسول خداﷺ کے سامنے ابراہیم آخری سانسیں لے رہے تھے تو آپؐ رونے لگے اور فرمایا: آنکھ روتی ہے اور دل غمگین ہوتا ہے''(۳)۔

---

(۱) الامالی (شیخ صدوق): ص ۲۱

(۲) سورہ یوسف(۱۲) آیت ۸۵

(۳) صحیح مسلم، ج۷، ص۷۷، کتاب الفضائل، باب رحمتہﷺ الصبیان ...؛ السنن الکبری(البیهقی) ج۴ ص ۶۹.

اسی طرح اہل سنت نے بیان کیا ہے: لـمّـا توفي ابن رسول اللهﷺ،ابراهيم، بكى رسول اللهﷺ؛ ''جب رسول خداﷺ کے فرزند حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپؐ روئے''(۱)۔

اسی طرح کی روایات کے پیش نظر اہل سنت کے معتبر مفسر فخر رازی نے کہا: أما البكاء فليس من المعاصي وروي أن النبيؐ بكى على ولده ابراهيم ''البتہ رونا گناہ نہیں ہے اور روایت میں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے اپنے بیٹے ابراہیم پر گریہ کیا تھا''(۲)۔

لہذا اہل سنت کی کتب میں موجود مذکورہ روایت کے مطابق رونا اور گریہ کرنا حرام یا ناجائز نہیں بلکہ سنت رسولؐ ہے۔

چہارم: معتبر تاریخ کے مطابق رسول خداﷺ کی زوجہ جناب عایشہ نے بھی آپؐ کی وفات پر عورتوں کے ساتھ ملکر چہرے پر ماتم کیا ہے لہذا تاریخ طبری میں جناب عائشہ کی زبانی نقل ہوا ہے کہ:انّ رسول الله قبض... ثم وضعت رأسه على وسادة وقمت ألتدم مع النساء وأضرب وجهي؛ جناب عائشہ نے بیان کیا:''رسول خداﷺ کی وفات ہوئی...پھر میں نے آپؐ کا سر اقدس ایک تکیہ پر رکھا اور دوسری عورتوں کے ساتھ ماتم کرتے ہوئے کھڑی ہوئی اور اپنا چہرہ پیٹنے لگی''؛ پس مذکورہ روایت کے مطابق یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اگر کوئی مسلمان ماتم کرنے کو بدعت یا حرام قرار دے تو گویا اُس نے ام المومنین پر الزام لگایا(۳)۔

پنجم: اہل سنت کی کتب کے مطابق جب جناب عمر کو یہ خبر ملی کہ ان کی بیٹی کو طلاق ہوگئی ہے تو انہوں نے غم کی شدت سے ماتم کرتے ہوئے اپنے سر میں خاک اور مٹی ڈالی طلّق رسول اللهﷺ

---

(۱)سنن (ابن ماجه) ج ۱ ص ۵۰۶،باب ماجاء فی البكاء على الميت.

(۲) تفسیر مفاتیح الغیب(فخر رازی): ج۹ ص ۱۹۴ .

(۳) تاریخ طبری: ج۲ ص ۴۴۱ سنہ ۱۱ ہجری کے حالات؛ مسند احمد: ج۶ ص ۲۷۴،حديث عائشة ط بيروت.

حفصة تطليقة فبلغ ذلک عمر فحثی التراب علی رأسه.. ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حفصہ کو طلاق دی، جب جناب عمر کو یہ خبر ملی تو انہوں نے اپنے سر میں خاک ڈالی''(۱)۔

اسی طرح اہل سنت کی ایک اور روایت میں ہے کہ: **أنّ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طلّق حفصة فبلغ ذلک عمر بن الخطاب فوضع التراب علی رأسه فقال: ما یعبأ بک یابن الخطاب بعدها فنزل جبریل علی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فقال ان الله یأمرک أن تراجع حفصة رحمة لعمر** ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حفصہ کو طلاق دے دی، جب جناب عمر کو یہ خبر ملی تو انہوں نے اپنے سر پر خاک ڈالی اور کہا: اے خطاب کے بیٹے اب اس کے بعد تمہیں کسی چیز کی پرواہ نہیں ہے، پھر پیغمبر اکرمؐ پر جبرائیل نازل ہوئے اور کہا: اے نبیؐ: اللہ تعالی، عمر پر رحمت کرتے ہوئے تمہیں یہ حکم دیتا ہے کہ حفصہ کو واپس بلالو''(۲)۔

پس اگر جناب عمر اپنی بیٹی کی طلاق کے غم میں اپنے سر میں خاک ڈالیں اور ماتم کریں تو جائز ہے، بلکہ اُن پر تو خدا کی رحمت ہوتی ہے اور اگر کوئی مسلمان نواسہء رسولؐ کی شہادت کے غم میں ماتم کرتے ہوئے سر میں خاک ڈالے تو بدعت یا حرام کیونکر ہوگا؟!!!

ششم: اسی طرح بعض اہل سنت مؤرخین نے بیان کیا ہے کہ جب جناب عمر بن خطاب کو نعمان بن مقرن کی موت کی خبر دی گئی تو وہ اپنا ہاتھ سر پر رکھ کر رونے لگے: **عن أبي عثمان: أتیتُ عمر بنعي النعمان بن مقرن، فجعل یده علی راسه و جعل یبکي** ''ابوعثمان نے بیان کیا ہے کہ میں نعمان بن مقرن کی موت کی خبر جناب عمر کے پاس لایا تو جناب عمر نے اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھا

---

(۱) اسد الغابة(ابن اثیر): ج۵ ص۴۲۶؛ الاصابة(ابن حجر): ج۸ ص۸۶؛ سیر أعلام النبلاء(ذهبی): ج۲ ص۲۲۹.

(۲) معجم کبیر(طبرانی) ج۲۳ ص۱۸۸ ،باب حفصة بنت عمر.

اور گریہ کرنے لگے‘‘(۱)؛ پس امام حسینؑ کے ماتم کی بنا پر شیعوں پر اعتراض کرنے والوں سے سوال ہے کہ وہ اس روایت کو مدنظر رکھتے ہوئے حضرت عمر کے اس عمل کے بارے میں کیا فتوی دیں گے؟!!!

ہفتم: امام حسینؑ کی عزاداری اور آپ کے لئے گریہ و بکا اور ماتم وعزا پر اعتراض کرتے ہوئے بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ’’ہم زندہ وجاوید کا ماتم نہیں کرتے‘‘ اور پھر اس جملہ کی تفصیل میں کہتے ہیں کہ چونکہ امام حسینؑ شہید ہیں اور شہید زندہ ہوتا ہے لہذا زندہ کے لیے گریہ و ماتم کرنا صحیح نہیں ہے۔

امام حسینؑ کے غم میں ماتم اور عزاداری کی مخالفت میں یہ دلیل بظاہر ایسی بہترین دلیل ہے کہ بہت سے سادہ لوح مسلمان اس دلیل کی خوش نمائی کی وجہ سے آسانی سے قبول کر لیتے ہیں اور بعض اوقات سعادت سے محروم ہو جاتے ہیں لہذا اس شبہ کا جواب مختلف طرح سے دیا جا سکتا ہے:

اولاً: کسی عزیز کی موت پر غم کا احساس کرتے ہوئے گریہ کرنا انسانی فطرت ہے چاہے وہ شہادت کی موت ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ اسلام میں اس فطری تقاضے کا احترام کرتے ہوئے شہید پر رونے سے منع نہیں کیا گیا۔

ثانیاً: ہم شہید کی ’’شہادت‘‘ پر نہیں روتے، یعنی ہمارے رونے کا سبب یہ نہیں ہے کہ امام حسینؑ شہید کیوں ہو گئے بلکہ ہم آپؑ پر ہونے والے مظالم پر روتے ہیں تا کہ اس طرح امامؑ کے ساتھ اپنی عقیدت و ہمدردی اور دشمنوں کے ساتھ بیزاری کا اظہار کریں۔

ثالثاً: حضرت یعقوبؑ کو علم تھا کہ حضرت یوسفؑ زندہ ہیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنے زندہ بیٹے کی مصیبت اور جدائی کے غم میں اتنا گریہ کیا کہ آنکھیں سفید ہو گئیں۔

رابعاً: اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ شہید زندہ ہوتا ہے کیونکہ شہید کی زندگی کا تصور براہ راست

قرآن مجید کی نصوص پر مبنی ہے لیکن قرآن مجید نے جہاں ہمیں شہید کی زندگی کی خبر دی ہے وہاں اس بات کی طرف بھی متوجہ کیا ہے کہ ہم شہید کی زندگی کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہیں چنانچہ اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا: ﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ ''جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں، انھیں مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم اس کا شعور نہیں رکھتے''(۱)؛ پس جب قرآن مجید کی اس نص کے مطابق ہمیں شہید کی زندگی کا شعور و ادراک ہی نہیں ہے تو پھر اس زندگی کو ماتم کی نفی کی دلیل کیسے بنایا جا سکتا ہے۔

خامساً: اگر شہید کی زندگی کی بنا پر اُس کا ماتم کرنا جائز نہیں ہے تو اُس کی زندگی ہی کی بنا پر اُسے دفن کرنا کیسے جائز ہو سکتا ہے؟!، کیا کسی زندہ شخص کو دفن کرنا جائز ہے؟!، اور کیا کسی زندہ شخص کی نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے؟! اور کیا کسی زندہ شخص کے اموال و املاک میراث سمجھ کر تقسیم کئے جا سکتے ہیں؟! اگر یہ سب امور بھی شہید کے لئے جائز نہیں ہیں تو بے شک شہید کا ماتم بھی نہ کیجئے۔

لیکن اگر شہید کا جنازہ پڑھنا جائز ہی نہیں بلکہ فرض ہے، اگر شہید کا دفن کرنا حرام نہیں بلکہ واجب ہے، اگر شہید کے اموال کا اُس کے وارثوں تک پہنچانا فرض ہے تو پھر شہید کے لئے رونا یا اُس کے غم میں ماتم کرنا کیسے ناجائز ہے؟! گویا شہید کی زندگی کو دلیل بناتے ہوئے اُس کے غم میں گریہ و ماتم پر اعتراض کا مطلب یہ ہوا کہ شہید صرف ماتم کے مسئلہ میں زندہ ہیں اور دوسرے تمام امور میں زندہ نہیں۔ پس جب شہید کی نماز جنازہ، اُس کا دفن اور اُس کی میراث کی تقسیم جیسے امور جائز بلکہ فرض ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شہید کی زندگی ہماری زندگی کی طرح نہیں ہے، لہذا

---

(۱) سورہ بقرہ/ ۱۵۴

(۱) المصنف (ابن ابي شيبة): ج۳ص ۲۴۴، باب ماقالوا في سبّ الموتى، طبع دار الفكر؛ عمدة القاری (عینی): ج۸ص ۷۹؛ مستدرک حاکم: ج۳ص ۲۹۳، ذكر فتح اصبهان (حاکم کی روایت کے مطابق جناب عمر نے اپنے ہاتھ اپنے چہرہ پر رکھے اور رونے لگے)۔

جب شہید کے لئے یہ سب امور جائز ہیں تو اُس پر رونا اور اُس کا ماتم کرنا بھی جائز ہے۔

سادساً: شہید پر رونا رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے چنانچہ بہت سے علماء ومؤرخین نے ذکر کیا ہے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ جنگ احد میں شہید ہوئے تو پیغمبر اکرمؐ نے خود بھی حضرت حمزہؓ شہید کا ماتم کیا اور دوسروں سے بھی کروایا: چنانچہ اہل سنت کے بعض معتبر علماء نے بیان کیا ہے: **لمّا رأی النبي حمزة قتيلا بكى فلمّا راى ما مثّل به شهق** (۱) ''جب پیغمبر اکرمؐ نے حضرت حمزہؓ کو شہید دیکھا تو روئے، پھر جب حضرت حمزہؓ کے مثلہ ہونے سے واقف ہوئے تو چیخ چیخ کر بلند آواز سے رونے لگے (۲)۔

اسی طرح جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ احد سے واپس آئے تو آپؐ نے انصار کی عورتوں کے رونے اور گریہ کی آوازیں سنیں جو اپنے شہداء کا ماتم کر رہیں تھیں، تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''آہ، میرے چچا حمزہؓ پر رونے والا کوئی نہیں''، جب انصار کی عورتوں کو یہ خبر ملی تو انہوں نے اپنے شہداء کی بجائے حضرت حمزہؓ کے لئے گریہ وماتم شروع کر دیا (۳)۔

---

(۱) شهق أی ارتفع، والشهقة كالصيحة: ''شھق یعنی اُس نے آواز بلند کی، اور شھقۃ یعنی چیخ یا بجلی کی کڑک کی طرح'' الصحاح (جوهری): ماده شهق)

(۲) ذخائر العقبی(احمد بن عبدالله طبری): ص ۱۸۰؛ اسد الغابة (ابن اثیر): ج ۲ ص ۴۸؛ لما جرّد رسول الله صلى الله عليه وآله حمزة بكى فلمّا رأى ما مثّل به شهق (میزان الاعتدال (ذهبی): ج ۴ ص ۱۶۸؛ لسان الميزان (ابن حجر): ج ۶ ص ۸۱)؛ فسار رسول الله صلى الله عليه وآله نحوه فلمّا رأى جبهته بكى ولما رأى ما مثل به شهق ''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حمزہ (کے جنازہ) کی طرف بڑھے، جب آپؐ نے حضرت حمزہ کی پیشانی دیکھی تو رونے لگے اور پھر جب آپؐ نے حضرت حمزہ کی مثلہ حالت کو دیکھا تو بلند آواز سے روئے'' (مستدرک (حاکم): ج ۳ ص ۱۹۹؛ الدر المنثور (جلال الدين سيوطی): ج ۲ ص ۹۷).

(۳) لمّا رجع رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم من احد سمع نساء الانصار يبكين فقال: لكن حمزة لا بواكي له، فبلغ ذلك نساء الانصار فبكين لحمزة... (المستدرک (الحاکم): ج ۱ ص ۳۸۱، کتاب الجنائز، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اسی طرح اہل سنت کی معتبر کتب میں موجود بعض روایات کے مطابق جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش پر انصار کی عورتوں نے آپؐ کے گھر آ کر جناب حمزہ پر گریہ و ماتم کیا تو آپؐ نے اُن عورتوں کیلئے دعا فرمائی اور پھر انہیں گھر سے رخصت فرمایا؛ پھر اہل سنت کے بعض محدثین نے بیان کیا ہے کہ اُس دن کے بعد جب بھی انصار میں سے کوئی فوت ہوتا تو مدینہ کی عورتیں پہلے حضرت حمزہ کا ماتم کرتیں اور پھر اپنی میت پر روتیں(۱)۔

پس ان روایات اور اہل سنت علماء کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ خدا کی راہ میں شہید ہونے والوں کے لیے گریہ اور ماتم نہ صرف جائز بلکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور آپؐ کی دعا کا سبب ہے۔

ہشتم: جب جنگ موتہ میں حضرت جعفر بن ابی طالب شہید ہوئے تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے گھر گئے، اہل خانہ سے تعزیت کے بعد فرمایا: **علی مثل جعفر فلتبک البواکي** ''جعفر جیسے پر رونے والوں کو رونا چاہیے(۲)؛ پیغمبر اکرمؐ کے اس فرمان سے نہ صرف میت کے لیے عزاداری اور ماتم کا جواز ثابت ہوتا ہے بلکہ جعفرؓ جیسے پرہیز گار افراد کیلئے گریہ و ماتم کرنے کا حکم بھی ثابت ہوتا ہے۔

باب البکاء علی المیت؛ مجمع الزوائد(الهیثمی): ج۶ ص ۱۲۰ کتاب المغازی، باب مقتل حمزة.

(۱) ...**فقالؐ: لکن حمزة لابواکی له فجاء نساء الانصار الی باب رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فبکین علی حمزة فدعا لهن رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وأمرهن بالانصراف، فهن الی الیوم اذا مات المیت من الانصار بدأ النساء فبکین علی حمزة ثم بکین علی میّتهن** (الطبقات الکبری(ابن سعد) باب من قُتل من المسلمین یوم اُحد، ج۲ ص ۴۴؛ و ج۳ ص ۱۱، باب حمزة بن عبدالمطلب).

(۲) انساب الاشراف (بلاذری): ص ۴۳، باب أسماء ولد أبی طالب؛ الجامع الصغیر (سیوطی): ج۲ ص ۱۵۹، وفیه الباکیة؛ کنز العمال(متقی هندی): ج ۱۱ ص ۶۲۰، ح ۳۳۱۸۷.

نہم: علماء اسلام کی روایات کے مطابق رسول خدا ﷺ نے امام حسینؑ کی زندگی ہی میں آپؑ پر آنے والے کربلا کے مصائب یاد کر کے گریہ کیا ہے، چنانچہ حضرت ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ رسول خدا ﷺ اپنے حجرے میں تھے کہ حسینؑ بھی حجرے میں داخل ہوئے، پھر میں نے رونے کی آواز سنی، جب حجرے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ حسینؑ آپؐ کے زانو پر ہیں اور پیغمبرؐ حسینؑ کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے رو رہے تھے، پھر پیغمبر اکرمؐ نے بتایا کہ ابھی جبرائیل آئے تھے اور مجھے حسینؑ کی شہادت کی خبر دی اور پھر جبرائیل نے کربلا کی کچھ خاک بھی حضورؐ کو دی؛ اس حدیث کے ناقل ھیثمی کہتے ہیں: **رواه الطبراني بأسانيد ورجال أحدها ثقات** ''اس روایت کو طبرانی نے کئی سند کے ساتھ اور کئی راویوں کے ذریعہ نقل کیا ہے اور ایک سند کے تمام راوی مؤثق ہیں(۱)۔

ان روایات واقعات کے مطالعہ کے بعد صاحب فہم وفراست مسلمانوں سے سوال ہے کہ کیا پیغمبر اکرمؐ کی یہ سیرت امام حسینؑ کے لیے عزاداری کے جواز کی دلیل نہیں ہے؟!!!

دہم: بعض اہل سنت علماء نے نقل کیا ہے: **قال: عجبا لقول الناس انّ عمر بن الخطاب نهى عن النوح، لقد بكى على خالد بن الوليد بالمدينة ومعه نساء بني المغيرة سبعا، يشققن الجيوب ويضربن الوجوه وأطعموا الطعام تلك الأيام حتى مضت ماينهاهن عمر**؛(۱) ''عبداللہ بن عکرمہ نے کہا: لوگوں کی یہ بات عجیب ہے کہ جناب عمر نے نوحہ وماتم کرنے

---

(۱) كان رسول الله ﷺ جالسا ذات يوم في بيتي قال لا يدخل على أحد فانتظرت فدخل الحسين فسمعت نشيج رسول الله ﷺ يبكي فأطلت فإذا حسين في حجره والنبي ﷺ يمسح جبينه وهو يبكي فقلت والله ما علمت حين دخل فقال إن جبريل عليه السلام كان معنا في البيت قال أفتحبه قلت أما في الدنيا فنعم قال إن أمتك ستقتل هذا بأرض يقال لها كربلاء فتناول جبريل من تربتها فأراها النبي صلى الله عليه وسلم...(مجمع الزوائد(هيثمى): ج۹ ص۱۸۸؛ المعجم الكبير (طبرانى): ج۳ص۱۰۹).

سے منع کیا ہے، حالانکہ وہ مدینہ میں سات دن تک خالد بن ولید پر روئے جبکہ اُسوقت بنی مغیرہ کی عورتیں بھی تھیں جنہوں نے اپنے گریبان چاک کرڈالے اور منہ پیٹا، اُن دِنوں لوگوں کو کھانا بھی کھلایا گیا، لیکن جناب عمر نے اُن ماتم کرنے والی عورتوں کو منع نہیں کیا''۔

مذکورہ روایت سے دو اہم نکات واضح ہوتے ہیں:

۱: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میت پر نوحہ و ماتم سے منع نہیں فرمایا بلکہ لوگوں میں مشہور یہ تھا کہ جناب عمر بن خطاب نے لوگوں کو اس کام سے منع کیا تھا اور اگر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع کیا ہوتا تو لوگ نوحہ و ماتم کی ممنوعیت کو جناب عمر کی طرف نسبت دینے کی بجائے پیغمبر اکرمؐ سے نسبت دیتے۔

۲: اس روایت کے مطابق لوگوں میں یہ مشہور بات بھی غلط نکلی کیونکہ راوی نے خود جناب عمر کو مدینہ میں، خالد بن ولید کی میت پر آہ و بکا اور ماتم کرتے ہوئے دیکھا تھا۔

پس ماتم کے حوالے سے ہمارے یہ دلائل دو دھاری تلوار کی مانند ہیں، کہ اگر ماتم کے منکر باطل تاویلات کے ذریعہ ان کے ماننے سے انکار کرتے ہوئے ماتم کو ناجائز یا بدعت وحرام کہیں گے تو دوسری دھار سے خود ہی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسی عظیم ہستی سمیت جناب عائشہ اور جناب عمر بن خطاب پر بھی الزام لگانے کے مجرم ٹھہریں گے۔

---

(۱) تاریخ مدینہ دمشق(ابن عساکر): ج۱۶ ص۲۷۷، باب ذکر من اسمہ خالد، (بن ولید).

سوال نمبر 22:

کیا حضرت امام علیؑ اور باقی آئمہ علیہم السلام، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ تمام سابقہ انبیاء سے افضل ہیں؟

مذکورہ سوال شیعوں کے عقائد پر کے اعتراضات میں سے ایک اہم اعتراض ہے چونکہ اہل تشیع (علماء میں مشہور قول کی بنا پر) حضرت امام علیؑ اور باقی گیارہ اماموں کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ تمام سابقہ انبیاء سے افضل مانتے ہیں، البتہ اہل تشیع کا یہ عقیدہ بلا دلیل نہیں ہے کیونکہ:

اول: سورہ بقرہ کی آیت ۱۲۴ ﴿إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا﴾ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امامت کا مرتبہ نبوت کے مرتبہ سے بلند اور افضل ہے، کیونکہ اس آیت مبارکہ کے شان نزول سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو خدائی امتحانات اور آزمائشوں کے نتیجہ میں نبوت کے مرتبہ کے بعد امامت کا رتبہ ملا۔

پس اگر امامت کا مرتبہ نبوت سے کمتر یا اسکے برابر ہوتا تو اللہ تعالی کی طرف سے حضرت ابراہیمؑ کے لیے نبوت کے درجہ کے بعد (بہت سے امتحانات اور آزمائشوں کے بعد) امامت کے رتبہ کا اعلان بے معنی ہو جاتا۔

لہذا مذکورہ آیت کی بنا پر یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ امامت کا مرتبہ نبوت سے افضل و برتر ہے؛ پس جب امامت کا نبوت سے افضل ہونا قرآن مجید سے ثابت ہے تو یقیناً امام، نبی سے افضل ہو گا، اس بنا پر یہ عقیدہ قرآن مجید کے عین مطابق ہے کہ حضرت امام علیؑ اور دیگر آئمہ علیہم السلام رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ (۱) دیگر انبیائے ماسلف سے افضل ہیں۔

دوم: محدثین نے نقل کیا ہے کہ رسول خداﷺ نے اپنے بارے میں فرمایا: **أنا سيد البشر** ''میں تمام انسانوں کا سردار ہوں'' یا فرمایا: **أنا سيد ولد آدم** ''میں آدمؑ کی تمام اولاد کا سردار ہوں''(۲)؛ دوسری طرف قرآن مجید کی آیت مباہلہ ﴿...فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَائَنَا وَأَبْنَائَكُمْ وَنِسَائَنَا وَنِسَائَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ...﴾(۳) میں حضرت علیؑ کو نفسِ رسولؐ اور جانِ پیغمبرؐ کے عنوان سے متعارف کروایا گیا ہے کیونکہ تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ مذکورہ آیت میں ﴿أَنْفُسَنَا﴾ کا مصداق صرف حضرت علیؑ ہیں، جو اس بات کی دلیل ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علیؑ اور رسول خداﷺ کے درمیان مساوات ہے، پس جب رسول خداﷺ، **سيد البشر یا سيد ولد آدم** ہونے کی بنا پر تمام سابقہ انبیاءؑ سے افضل ہیں تو **مساوي الأفضل أفضل** ''افضل کا مساوی

---

(۱) اس نظریہ میں رسول خداﷺ کو دیگر انبیاء سے اس لئے استثناء کیا گیا ہے کہ آپؐ نبوت و رسالت کے علاوہ امامت کے مرتبہ پر بھی فائز تھے، البتہ نبوت و رسالت آپؐ پر ختم ہوگئی ہے لیکن امامت کے مرتبہ میں آپؐ کے بارہ جانشین ہیں جنہیں شیعہ اپنا امام مانتے ہیں، اور یہ بارہ امام اگرچہ نبی یا رسول نہیں ہیں لیکن خدا کی طرف سے پیغمبر اکرمؐ کے بعد امت کے امام اور پیشوا ہیں اور چونکہ امامت کا درجہ نبوت سے افضل ہے لہذا یہ بارہ امام ایسے تمام انبیاء سے یقیناً افضل ہیں جو امامت کے رتبہ سے محروم رہے؛ سید ھبۃ اللہ شہرستانی ایسے ہی ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں: تمام انبیاء کے سردار کی جانشینی اور خلافت مرتبہ کے لحاظ سے مقام نبوت سے کمتر نہیں ہے اس بنا پر ہمارے امام اگرچہ مقام نبوت کے حامل نہیں تھے لیکن سید الرسل کے جانشین تھے اور بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی بڑی حکومت کا وزیر کسی چھوٹی حکومت کے سربراہ سے کئی درجہ برتر و افضل ہوتا ہے۔

(۲) صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب معجزات النبى؛ المستدرک (حاكم نيسابورى)، كتاب تواريخ المتقدمين، باب ذكر اسماء النبى؛ شرح نهج البلاغه: ج ۱۱ ص ۶۲، خطبه ۲۰۷.

(۳) سورہ آل عمران : آیت ۶۱

بھی افضل ہی ہوتا ہے'' کے عقلی قاعدہ کے تحت حضرت علیؑ بھی نفس رسولؐ ہونے کی بنا پر رسول خدا

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ باقی تمام انبیاء سے افضل قرار پائیں گے۔

سوم: فریقین کے درمیان متفقہ بہت سی احادیث بھی پیغمبر اکرمؐ اور حضرت علیؑ کے درمیان مساوات کو بیان کرتی ہیں، جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **خلقت أنا وعلي من نور واحد** ''مجھے اور علی کو ایک ہی نور سے خلق کیا گیا''(۱)؛ اسی طرح محدثین نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: **علي مِنّي وأنا منه وهو وليّ كلّ مؤمن من بعدي** ''علی مجھ سے ہے اور میں علی سے ہوں اور وہ میرے بعد ہر صاحبِ ایمان کا مولی ہے''(۲)

مذکورہ احادیث میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علیؑ کی وحدت جسمی اور مادی نہیں ہے بلکہ روحانی اور صفاتی وحدت ہے اور یہی وحدت و مساوات اس بات کی واضح دلیل ہے کہ جس طرح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیگر تمام انبیاء سے افضل ہیں اسی طرح علی مرتضیٰ علیہ السلام بھی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ دیگر تمام انبیاء سے افضل ہیں۔

چہارم: اہل سنت کے معتبر علماء نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ، امام مہدیؑ کی اقتداء میں نماز ادا کریں، اور بعض اہل سنت علماء نے حضرت عیسیٰؑ کی، امام مہدی عج کی اقتداء میں نماز ادا کرنے کو متواتر احادیث میں سے شمار کیا ہے(۳)، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام مہدیؑ حضرت

---

(۱) الخصال (شیخ صدوق): ص۱۳، طبع جامعة المدرسین؛ ینابیع المودة (قندوزی حنفی) ج۲ ص۳۰۳، طبع اول ۱۴۱۶، دار الاسوة.

(۲) فضائل الصحابة (النسائی): ص۱۵؛ الامالی (شیخ طوسی): ص۵۰ طبع اول ۱۴۱۴ھ، دار الثقافة.

(۳) ابن حجر نے ابوالحسن الخشعی سے نقل کیا ہے: تواترت الاخبار بأن المهدي من هذه الامة وأن عيسى يصلي خلفه (فتح الباری (ابن حجر): ج۶ ص۳۵۸)

عیسیٰ علیہ السلام سے افضل ہیں، جبکہ حضرت مہدیؑ امام ہیں اور حضرت عیسیٰؑ نبی۔

پنجم: بعض علماء نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا: **علماء أُمّتی کأنبیاء بني اسرائیل** ''میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء جیسے ہیں''(۱)، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ آئمہ علیہم السلام امت کے عام علماء سے افضل ہیں، پس اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ آئمہ علیہم السلام بنی اسرائیل کے انبیاء سے افضل ہیں۔

ششم: اہل سنت کی معتبر کتب میں یہ حدیث موجود ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کی شان میں فرمایا: **من أراد أنْ ینظر الی آدم في علمه، والی نوح في حلمه، والی ابراهیم في خلّته، والی موسی في هیبته، والی عیسی في عبادته، فلینظر الی علي بن أبي طالب**؛ ''جو شخص حضرت آدمؑ کو اُن کے علم میں، حضرت نوحؑ کو اُن کے حلم میں، حضرت ابراہیمؑ کو ان کی خُلت میں، حضرت موسیٰؑ کو ان کی ہیبت میں، اور حضرت عیسیٰؑ کو اُن کی عبادت میں دیکھنا چاہے تو وہ علی بن ابی طالب کی طرف دیکھ لے''(۲)۔

اس حدیث کے مطابق حضرت علیؑ، سابقہ انبیاء کی صفات کمال میں ان کے شریک ہیں اور چونکہ ان انبیاء کی بارز صفات کمال میں صرف ایک ایک صفت تھی لیکن حضرت علیؑ ان انبیاء کی تمام صفات کمال کے حامل تھے پس یقیناً آپؑ سابقہ انبیاء سے افضل قرار پائیں گے۔

---

(۱) عوالي اللئالي (ابن ابي جمهور الاحسائی): ج۴ص۷۷.

(۲) تاریخ مدینة دمشق(ابن عساکر) ج۴۲، ص۳۱۳.

سوال نمبر 23:

کیا نماز تراویح رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت ہے؟

عرف میں تراویح اس آٹھ یا بیس رکعت نماز کو کہا جاتا ہے کہ جو اہل سنت مسلمان رمضان المبارک کے مہینے میں ہر شب سنت کی نیت سے مساجد میں باجماعت، ادا کرتے ہیں کیونکہ ماہ رمضان کے شروع ہوتے ہی بعض اہل سنت مولوی حضرات کی طرف سے یہ شور وغل شروع ہو جاتا ہے کہ جب تک تراویح کی نماز نہ پڑھی جائے اس وقت تک روزہ کامل نہیں ہوتا اور پھر اس نماز کو سنت رسولؐ کا نام دیا جاتا ہے، سادہ لوح اور بھولے بھالے اہل سنت مسلمان عرصہ دراز سے اس نماز کو سنت رسولؐ سمجھ کر پڑھتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ نماز واقعا سنت رسولؐ ہے یا آپؐ کے بعد اس نماز کو دین میں داخل کیا گیا؟

ذیل میں اس حوالے سے چند نکات ملاحظہ فرمائیں:

اول: نماز تراویح کی حقیقت سے واقفیت نہ رکھنے والے شخص کے لیے شاید یہ بات عجیب ہو لیکن تاریخ اسلام سے واقف ہر شخص جانتا ہے کہ نہ تو پیغمبر اکرمؐ نے نماز تراویح پڑھی اور نہ ہی آپؐ نے ماہ رمضان کے مستحب نوافل کو باجماعت پڑھنے کا حکم دیا۔ کیونکہ واجب نمازوں مثل نماز پنجگانہ، نماز طواف، نماز عیدین، نماز آیات، نماز میت و... اور مستحب نمازوں میں سے نماز استسقاء (وہ نماز کہ جو طلب باران کے لیے پڑھی جاتی ہے) کے علاوہ کسی دوسری نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھنا شرعا جائز نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ نماز پنجگانہ کے نوافل اور سنتیں، نماز تہیت مسجد اور باقی مستحب نمازوں اور نوافل کو جماعت کے ساتھ نہیں پڑھا جاتا۔ کیونکہ مستحب نمازوں کو جماعت کے ساتھ پڑھنے کا حکم نہ تو قرآن میں ہے اور نہ ہی رسول اکرمؐ نے یہ حکم صادر فرمایا۔

البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبر اکرمؐ ماہ رمضان کی مستحب نمازوں کو بغیر جماعت کے فرادیٰ پڑھا کرتے تھے اور لوگ بھی آپؐ کی پیروی کرتے ہوئے مستحب نمازوں کو بغیر جماعت ہی کے ادا کرتے تھے۔ جیسا کہ بخاری شریف میں ہے: رسول اکرمؐ نے فرمایا ''جو شخص بھی ماہ رمضان میں ایمان کے ساتھ اور اپنا احتساب کرتے ہوئے مستحب نمازیں ادا کرے خداوند اس کے گزشتہ تمام گناہ معاف کر دے گا ابن شھاب نے کہا: چنانچہ رسول اکرمؐ کی وفات تک ایسا ہی تھا (یعنی لوگ ماہ رمضان کی مستحب نمازوں کو بغیر جماعت کے پڑھا کرتے تھے) پھر ابوبکر کی خلافت کے دور میں اور عمر کی خلافت کے ابتدائی ایام میں بھی ایسا ہی تھا''(۱)۔

دوم: اہل سنت کی تمام معتبر کتب اس بات کی تصدیق کرتی ہیں ہے کہ باجماعت نماز تراویح کی ایجاد جناب عمر نے کی انھوں ہی نے لوگوں کو ماہ رمضان کے مستحب نوافل کو باجماعت پڑھنے کا حکم دیا جبکہ ایسی کوئی باجماعت نماز نہ تو پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں تھی اور نہ ہی جناب ابوبکر کی خلافت کے زمانے میں پڑھی جاتی تھی، چند مستند حوالہ جات ملاحظہ فرمائیں۔

1:۔شرح صحیح بخاری میں جناب عمر کے اس قول **نعم البدعة هذه** ''یہ (نماز تراویح) اچھی بدعت ہے''(۲)؛ کے ذیل میں لکھا ہے ''جناب عمر نے نماز تراویح کو اس لیے بدعت کہا چونکہ رسول خداﷺ نے ماہ رمضان کی مستحب نمازوں کو جماعت کے ساتھ پڑھنے کا حکم نہیں دیا تھا نیز یہ کہ نماز تراویح جناب ابوبکر صدیق کے زمانے میں بھی رائج نہیں تھی اور اس نماز کی رکعات کی تعداد

---

(۱) ... فتوفي رسول الله ﷺ والامر على ذلک ثم كان الامر على ذلک في خلافة أبي بكر وصدرا من خلافة عمر، (صحيح بخاری: ج۲، كتاب الصوم، باب: فضل من قام رمضان).

(۲) صحيح بخاری: كتاب الصوم، باب: فضل من قام رمضان.

بھی (معین) نہ تھی''(۱)۔

2:۔ اہل سنت کی معتبر کتب کے مطابق جناب عمر وہ پہلے فرد ہیں جنہوں نے نماز تراویح کو باجماعت پڑھنے کا حکم دیا(۲)۔

لہذا یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اہل سنت کی معتبر کتب کے مطابق رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں نماز تراویح نہیں پڑھی جاتی تھی، جناب ابوبکر کے دوران خلافت میں بھی نماز تراویح نہیں پڑھی جاتی تھی اور نہ ہی جناب عمر کی خلافت کے ابتدائی دنوں میں نماز تراویح کا وجود تھا، چنانچہ جب سنہ ۱۲ جمادی الثانی سنہ ۱۳ ہجری کو جناب ابوبکر نے وفات پائی اور جناب عمر نے خلافت سنبھالی تو اس سال کے ماہ رمضان کو رسول اکرمؐ کے طریقے کے مطابق (نماز تراویح کے بغیر) گزارا لیکن سنہ ۱۴ ہجری کے ماہ رمضان کی ایک شب جب جناب عمر چند ساتھیوں کے ساتھ مسجد نبوی کی طرف آئے تو دیکھا کہ لوگ رسول اکرمؐ کے طریقے کے مطابق ماہ رمضان کی مستحب نمازیں پڑھنے میں مشغول ہیں بعض قیام کی حالت میں تھے اور بعض رکوع کی حالت میں، کچھ سجدہ میں تھے اور کچھ بیٹھے ہوئے تسبیحات پڑھ رہے تھے، جبکہ کچھ تلاوت قرآن میں مشغول تھے۔ جناب عمر کو یہ منظر پسند نہ آیا اور حکم دیا کہ تمام نمازی ایک ہی امام جماعت کے پیچھے مستحب نمازوں کو جماعت کے ساتھ بجالائیں اور پھر ''نماز تراویح'' رائج ہوگئی۔

سوم: اہل سنت کی معتبر کتب کے مطالعہ سے اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ نماز تراویح کو ایجاد کرنے والے جناب عمر نے اس مسئلہ میں اپنی دیانتداری کا ثبوت دیتے ہوئے خود ہی نماز

---

(۱) ارشاد الساری فی شرح صحیح بخاری اور تحفۃ الباری فی شرح صحیح بخاری میں بھی اسی قسم کی عبارت موجود ہے۔

(۲) وهو أول من سن قيام شهر رمضان وجمع الناس على ذلک ...(الطبقات الكبرى(ابن سعد) ج۳ ص ۲۸۱،ذكر عمر؛ شرح نهج البلاغة (ابن ابى الحديد): ج۱۲ ص۷۵)

تراویح کو بدعت بھی کہا ہے، جیسا کہ اہل سنت کی معتبر ترین کتاب صحیح بخاری میں ہے: عبدالرحمٰن

ابن عبدالقاری نے بیان کیا ہے: ''ماہ رمضان کی ایک رات جناب عمر بن خطاب کے ساتھ مسجد کی طرف گیا (ہم نے دیکھا کہ) لوگ متفرق حالت میں نماز پڑھ رہے تھے، کوئی تنہا نماز پڑھ رہا تھا اور کوئی دوسرے کی اقتدا کر رہا تھا، یہ دیکھ کر جناب عمر نے کہا: میرا خیال ہے کہ اگر ان سب کو ایک ہی قاری کی اقتداء میں جمع کر دوں تو بہتر رہے گا پھر تمام نمازیوں کو ابی بن کعب کی اقتدا میں نماز پڑھنے کا حکم دیا، پھر دوسری رات میں اور جناب عمر مسجد کی طرف گئے تو دیکھا کہ تمام لوگ ایک ہی امام جماعت کی اقتدا میں ماہ رمضان کے نوافل ادا کر رہے ہیں، اسوقت جناب عمر نے کہا: ''یہ اچھی بدعت ہے''(۱)۔

اس روایت سے چند اہم نکات واضح ہوتے ہیں:

1:۔ جناب عمر کی خلافت کے ابتدائی دنوں تک اصحاب رسولؐ اور تابعین ماہ رمضان کے نوافل کو باجماعت نہیں پڑھا کرتے تھے۔

2:۔ جناب عمر کی ذاتی رائے یہ تھی کہ اگر ماہ رمضان کے نوافل کو باجماعت پڑھا جائے تو بہتر ہوگا۔

3:۔ جناب عمر وہ پہلے فرد ہیں کہ جنہوں نے مستحب نمازوں کو باجماعت پڑھنے کا حکم دیا

4:۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ نماز تراویح ایسی نماز ہے کہ جیسے جناب عمر نے خود اپنی زبان سے بدعت کہا ہے۔

---

(۱) عن عبد الرحمن بن عبد القاری أنه قال خرجت مع عمر بن الخطاب في رمضان الی المسجد فاذا الناس متفرقون یصلي الرجل لنفسه ویصلی الرجل فیصلي بصلاته الرهط فقال عمر اني أری لو جمعت هؤلاء علی قاری واحد ... قال عمر نعم البدعة هذه. (صحیح بخاری: ج۲، کتاب الصوم، باب: فضل من قام رمضان)

چہارم: ''تراویح'' نام کی کوئی نماز پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں نہیں تھی اور نہ ہی اہل سنت کی کسی

معتبر یا غیر معتبر کتاب میں، کسی صحیح حدیث یا ضعیف روایت سے لفظ تراویح بزبان رسولؐ ثابت ہے۔ البتہ جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا کہ رسول اکرمؐ کے زمانے میں مسلمان ماہ رمضان کے مستحب نوافل ضرور ادا کرتے تھے لیکن بغیر جماعت کے۔

پنجم: ماہ رمضان کے نوافل کے بارے میں جناب عمر کی ذاتی رائے یہ تھی کہ انھیں باجماعت ادا کیا جائے کیونکہ یقیناً نماز جماعت بہت سے اجتماعی فوائد کی حامل ہے لہذا انھوں نے اس وقت کے لوگوں کو بطور حاکم وقت حکم دیا کہ ان نوافل کو باجماعت ادا کیا جائے حالانکہ جناب عمر کے پاس اس اجتھاد کی کوئی شرعی دلیل نہیں تھی اور نہ ہی انھیں کوئی حق پہنچتا تھا کہ وہ شرعی امور میں اپنی ذاتی رائے کے مطابق حکم دیں کیونکہ دین، پیغمبر اکرمؐ ہی کے زمانے میں کامل ہو چکا تھا اور چونکہ پیغمبر اکرمؐ نے اس مستحب نماز کو باجماعت نہیں پڑھا اور نہ ہی امت کو ایسا کوئی حکم دیا ہے اسلیے کسی امتی کو بھی کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کے مخالف عمل کرے کیونکہ اللہ کا فرمان ہے کہ: ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ﴾ ''کسی مومن اور مومنہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ جب اللہ اور اسکا رسول کوئی فیصلہ کر دیں تو وہ اس میں اپنی مرضی اختیار کرے'' (۱) نیز ارشاد فرمایا: ﴿مَا آتَاكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾ ''جو تمہیں رسولؐ دے اسے لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ'' (۲) پس جناب عمر کا باجماعت نماز تراویح کے بارے اجتہاد صحیح نہیں تھا۔

ششم: اگر کہا جائے کہ جناب عمر نے باجماعت نماز کے فوائد کے مدّنظر رکھتے ہوئے اسی حکمت کے تحت مستحب نوافل کو باجماعت پڑھنے کا حکم دیا تھا لہذا اس میں کیا اعتراض ہے؟ تو ہم پوچھیں

---

(۱) سورہ أحزاب (۳۳) آیت ۳۶ (۲) سورہ حشر (۵۹) آیت ۷

گے کہ کیا جناب عمر نماز تراویح کو باجماعت پڑھنے کا حکم دے کر کسی ایسی حکمت کا تدارک کرنا

چاہتے تھے کہ جس سے (نعوذ باللہ) خدا اور رسولؐ غافل تھے؟

اگر مستحب نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھنے ہی میں مصلحت ہے تو پھر جناب عمر سے پہلے جناب ابوبکر (جو اہل سنت کے نزدیک جناب عمر سے بھی افضل و اعلم تھے) نے نماز تراویح کو باجماعت کیوں نہیں پڑھا، یا دوسروں کو باجماعت پڑھنے کا حکم کیوں نہیں دیا؟

اس سے بڑھ کر رسول اکرمؐ جو پوری کائنات سے افضل و اعلی اور عالم و اولی ہیں اور باجماعت نماز کی مصلحت سے بھی بخوبی واقف ہیں انھوں نے ماہ رمضان کے نوافل کو باجماعت پڑھنے کا حکم کیوں نہیں دیا؟ اور دین اسلام سے معمولی واقفیت رکھنے والا ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ خدا و رسولؐ اس موضوع سے غافل نہیں تھے اسی لیے شریعت اسلام میں نمازوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱؛۔ واجب نمازیں ۲: مستحب نمازیں

واجب نمازوں کو ایک مصلحت کے تحت جماعت کے ساتھ ادا کرنے پر تاکید کی گئی جبکہ مستحب نمازوں کو ایک اور مصلحت کے تحت جماعت کی قید سے آزاد کر کے فرادیٰ پڑھنے کے لیے کہا گیا۔

ہفتم: ممکن ہے کہ بعض حقیقت پسند اہل سنت مسلمان حقیقت کو قبول کرتے ہوئے یہ سوال کریں: ہم تسلیم کرتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے نماز تراویح کا حکم نہیں دیا بلکہ اس نماز کو جناب عمر کے حکم سے جاری کیا گیا لیکن کیا نوافل ادا کرنا نیک عمل نہیں ہے؟ اگر جواب مثبت ہے تو رمضان کے پر برکت مہینے میں مسلمانوں کے مسجد میں جمع ہو کر نماز پڑھنے اور نوافل ادا کرنے پر اعتراض کیوں ہے؟

جواب:۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مستحب نماز پڑھنا اور نوافل کا بجالانا ایک اچھا اور نیک عمل ہے اور اگر یہی نیک عمل ماہ رمضان جیسے پر برکت مہینے میں انجام دیا جائے تو اور زیادہ ثواب اور رحمت خداوندی کا باعث ہے لیکن یاد رہے کہ نماز تراویح پر اعتراض اس حیثیت سے نہیں ہے کہ ماہ رمضان میں اہل سنت مسلمان نوافل کیوں ادا کرتے ہیں بلکہ یہ اعتراض اس حیثیت سے ہے کہ:

اولاً: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس انداز سے ماہ رمضان کے نوافل ادا نہیں فرمائے جیسے اہل سنت مسلمان تراویح ادا کرتے ہیں۔

ثانیاً: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت علیہم السلام نے نماز تراویح پڑھنے سے منع کیا ہے۔

ثالثاً: ماہ رمضان کے مستحب نوافل کو باجماعت ادا کرنے کا حکم قرآن اور سنتِ رسولؐ سے ثابت نہیں ہے اور جو عمل دین اسلام میں سے نہیں اُسے دین کا حکم سمجھ کر انجام دینا بدعت ہے اور پیغمبر اکرمؐ کا فرمان ہے: ''ہر بدعت گمراہی کا باعث ہے اور ہر گمراہی جہنم کی طرف لے جانے والی ہے''(۱)۔

اس بنا پر اگر اہل سنت مسلمان ماہ رمضان کی برکتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فقط بیس رکعتوں کی بجائے ہر رات سو رکعت نماز بھی بجا لائیں اور ساری رات کھڑے ہو کر عبادت کریں، نوافل ادا کریں جب بھی یقیناً ثواب کا کام ہے لیکن ان نوافل کو باجماعت ادا کرنا بدعت ہے کہ جس سے نہ خدا راضی ہے اور نہ ہی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

ہشتم: البتہ یہ کہنا کہ جناب عمر نے اس نماز کو اچھی بدعت کہا ہے لہذا نماز تراویح کا بدعت ہونے کے باوجود، بجالانا جائز ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب تمام مسلمانوں کے نزدیک متفقہ حدیث میں پیغمبر اکرمؐ نے ارشاد فرما دیا: ہر بدعت گمراہی اور جہنم کی طرف لے جانے والی ہے تو پھر بدعت کی تقسیم (بدعة حسنة اور بدعة سيّئة) صحیح نہیں بلکہ بدعت بدعت ہی رہے گی اور گمراہی کا سبب ہوگی۔

---

(۱) كلّ بدعة ضلالة وكلّ ضلالة في النار يا فان مصيرها الى النار: مسند أحمد (أحمد بن حنبل): ج۴ص ۱۲۶؛ سنن ابن ماجة: ج ۱ ص ۱۶؛ المستدرک (الحاکم): ج ۱ ص ۹۶؛ فتح الباری، سنن نسائی اور اہل سنت کی دیگر بہت سی معتبر کتب؛ اصول کافی (الشیخ الکلینی): ج ۱ ص ۵۶)

سوال نمبر 24:

خلفاء راشدین سے مراد کون ہیں؟

عصر حاضر میں اہل سنت مسلمانوں کے درمیان خلفاء راشدین کی اصطلاح صرف جناب ابوبکر، عمر، عثمان اور امیر المومنین حضرت علیؑ کیلئے استعمال ہوتی ہے اور صرف انہی چار افراد کو خلفاء راشدین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور اہل سنت نے یہ اصطلاح پیغمبر اکرم ﷺ کی اُس حدیث سے اخذ کی ہے کہ جس میں آپؐ نے فرمایا: **عليكم بسنّتي وسنّة خلفاء الراشدين المهديّين من بعدي**(۱) ''تمہارے لیے میری اور میرے بعد (صراط مستقیم کی طرف) ہدایت کرنے والے خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرنا ضروری ہے'' اسی لیے اہل سنت حضرات، پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد چاروں خلفاء کی بالترتیب پیروی واجب وضروری سمجھتے ہیں۔

یقیناً جن افراد کو رسول خدا ﷺ کی زبانی **راشدین** اور **مهديّين** کا خطاب ملا ہو اُن کی پیروی واجب وضروری ہے لیکن اصل سوال یہ ہے کہ وہ کون افراد ہیں کہ جنہیں رسول اکرم ﷺ نے **راشدین** اور **مهديّين** کا خطاب دیتے ہوئے، اُنکی پیروی کو واجب ولازم قرار دیا ہے؟

اس سوال کے جواب کیلئے چند نکات کی طرف توجہ ضروری ہے:

اول: چونکہ کسی روایت میں بھی رسول خدا ﷺ نے واضح طور پر بیان نہیں فرمایا کہ خلفاء راشدین سے مراد پہلے چار خلفاء (یعنی جناب ابوبکر، جناب عمر، جناب عثمان اور امیر المومنین

---

(۱) سنن (ابی داؤد): ج۴ص ۲۰۰، حدیث ۴۶۰۷.

حضرت علیؑ) ہیں، لہذا صرف اِنہی چار افراد کو خلفاء راشدین قرار دینا، دعوی بلا دلیل ہے۔

دوم: اہل سنت کی معتبر کتب میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانی خلفاء راشدین کی تعداد بتائی گئی ہے کہ وہ بارہ ہیں:

۱: اہل سنت کے معتبر عالم ''طبرانی'' نے بیان کیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لایزال ھذا الدین عزیزا منیعاالی اثنی عشر خلیفة** ''یہ دین اسوقت تک سربلنداور پائیدار رہے گا جب تک بارہ خلفاء میں سے کوئی ایک رہے گا''(۱)۔

۲: ایک اور روایت کے مطابق آپؐ کا ارشاد ہے: **لایزال ھذا الدین قائما حتی یکون علیکم اثنا عشر خلیفة** ''یہ دین اُسوقت تک باقی رہے گا جب تک کہ تم پر بارہ خلفاء نہ ہو جائیں''(۲)۔

۳: اسی طرح اہل سنت علماء ومحدثین نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان بھی نقل کیا ہے: **قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لایزال هذا الدین عزیزا منیعا ینصرون علی من**

---

(۱) المعجم الکبیر(طبرانی): ج ۲ ص ۱۹۵، باب عامر الشعبی؛ کنزالعمال (متقی هندی): ج ۱۲ ص ۲۲؛ صحیح (مسلم): ج ۶ ص ۳، باب الناس تبع لقریش والخلافة فی قریش؛ سنن (أبی داود): ج ۲ ص ۹۰۳ آخر کتاب الفتن کتاب المهدی.

(۲) سنن (أبی داود): ج ۲ ص ۹۰۳، آخر کتاب الفتن کتاب المهدی؛ المعجم الکبیر (طبرانی): ج ۲ ص ۲۰۷، باب ابو خالد الوالبی؛ کنز العمال (متقی هندی): ج ۱۱ ص ۳۴، کتاب الفتن والاهواء، فصل ثالث، في الفتن والهرج؛ فتح الباری(ابن حجر عسقلانی): ج ۱۳ ص ۱۸۲، کتاب الاحکام، باب الاستخلاف.

ناواهم علیه الی اثنی عشر خلیفة (۱)۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان واضح دلیل ہے کہ دین کی عزت وعظمت اور بقاء رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارہ خلفاء کی وجہ سے ہے کہ جنہیں دین کی حفاظت کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے پس وہی خلفاء راشدین ہیں اور ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ ان کی پیروی اختیار کرے، لہذا اہل سنت کی معتبر کتب میں تواتر کے ساتھ موجود مذکورہ، ناقابل انکار روایات اور پیغمبر اکرمؐ کے ارشادات سے خلفاء راشدین والی حدیث کی وضاحت ہوتی ہے کہ خلفاء راشدین کی تعداد چار نہیں بلکہ بارہ ہے، اور پیغمبر اکرمؐ نے اپنے بعد انہی بارہ خلفاء کی پیروی کو واجب ولازم قرار دیا ہے۔

سوم: اب سوال یہ ہے کہ وہ بارہ خلفاء کون کونسے ہیں کہ جنہیں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلفاء راشدین کے خطاب سے نوازا ہے؟

اس سوال کے جواب میں اگرچہ انتہائی معتبر اہل سنت علماء بھی بوکھلاہٹ کا شکار ہوگئے ہیں اور بارہ خلفاء کی تعیین سے عاجز نظر آتے ہیں، انہوں نے یہ تعداد پوری کرنے کیلئے ولید بن عبدالملک کو بھی خلیفہ شمار کیا ہے جس نے قرآن پر تیر برسائے، حتی کہ بعض نے بارہ خلفاء کی تعداد پوری کرنے کیلئے یزید جیسے فاسق وفاجر کو بھی خلفاء میں سے شمار کیا ہے (۲)؛ لیکن اہل تشیع کا مؤقف اس معاملہ میں انتہائی واضح ہے اور شیعہ حضرات کے نزدیک پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن بارہ خلفاء کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں خلفاء راشدین قرار دیا ہے وہ صرف امام علیؑ سے لیکر امام مہدی عج تک بارہ امامِ برحق ہیں، اور ان کے علاوہ کسی کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خلفاء راشدین کا خطاب نہیں دیا۔

---

(۱) مسند (أحمد بن حنبل): ج ۵ ص ۹۹.

(۲) شرح صحیح الترمذی (ابن عربی): حدیث خلفاء کے ذیل میں.

مسلمان بھائیوں سے دوسوال:

جس طرح ہم نے اس کتاب کے مقدمہ میں تصریح کی ہے کہ عصر حاضر میں تمام شیعہ وسنی مسلمانوں کے درمیان وحدت واتحاداور باہمی ہمدلی وہمفکری کی اشدضرورت ہے، ہم دوبارہ اسی بات پر تاکید کرتے ہیں کہ اس نازک دور میں امت مسلمہ کے درمیان تفرقہ واختلاف ڈالنے کی کوشش کرنا پوری امت مسلمہ کے ساتھ خیانت کرنے کے مترادف ہے، لیکن اس بات کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے ہم ایکدوسرے کے مذہبی عقائد ونظریات کو سمجھنے اوران کے بارے میں غوروفکر کرنے سے پرہیز کریں، بلکہ ایکدوسرے کے عقائد ونظریات کو سمجھنا درحقیقت وحدت واتحاد کی طرف قدم بڑھانا ہے، اسی مقصد کے تحت ہم یہاں اپنے مسلمان بھائیوں سے دواہم سوال کے ضمن میں کچھ مطالب پیش کررہے ہیں۔

1: کیا شریعت کے احکام کو صرف مذہبی تعصب کی بناپر بدل کر پیش کرنا صحیح ہے؟!

یقیناً کوئی عاقل اور باشعور مسلمان یہ بات قبول نہیں کرے گا کہ کسی شرعی اوراسلامی حکم کو مذہبی تعصب کی نذر کرتے ہوئے صرف اس لیے بدل کر پیش کیا جائے کہ مسلمانوں کا کوئی اور گروہ اُس حکم کے مطابق عمل کرتا ہے۔

بعض اہل سنت علماء وفقہا کے فتاوی سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ انہوں نے شریعت کے بہت سے یقینی احکام کو بھی مذہبی تعصب کی بھینٹ چڑھا دیا ہے اور بعض دینی مسائل میں صرف شیعہ مسلمانوں کی مخالفت میں شرعی حکم کے برعکس فتوی دیا ہے۔

یقیناً یہ بات تلخ ضرور ہے اور شاید عام مسلمان اس بات کو صرف ایک تہمت خیال کریں اس لئے ضروری ہے کہ اہل سنت علماء کے اقرار کے ذریعہ اس حقیقت کو ثابت کیا جائے تاکہ تمام

مسلمان بھائی اس مسئلہ کی حقیقت اور مذہبی تعصب ولجاجت سے آگاہ ہوسکیں۔

۱): اہل سنت کے امام ''غزالی'' نے قبر کو ہموار بنانے کے سلسلہ میں اقرار کیا ہے کہ شرعی طریقہ یہ ہے کہ قبر کو ہموار بنایا جائے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے بھی یہی چیز ثابت ہے لیکن جب شیعوں نے اسے اپنا طریقہ کار بنالیا تو اہل سنت کے امام غزالی نے شیعوں کی مخالفت میں قبر کو بلند (اونٹ کی کوھان کی طرح) بنانے کا فتوی دیا(۱)۔

پھر امام غزالی نے دینی احکام میں شیعوں کی مخالفت کی تصریح کرتے ہوئے بیان کیا ہے: ''ہم صرف احکام کی ہیئت وصورت میں شیعوں کی مخالفت کرتے ہیں جیسے دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہننے کے مسئلہ میں، یا اسی طرح کے دیگر مسائل میں(۲)۔

۲): حنفی مذہب کے امام، زمخشری نے آیت مبارکہ: ﴿إِنَّ اللهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾(۳)، کی تفسیر کے ضمن میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ دوسرے افراد پر درود وصلوات بھیجنے کے مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

''اس آیت مبارکہ اور دیگر آیات واحادیث کی بناء پر کسی بھی مومن پر درود بھیجنا شرعاً جائز ہے لیکن اگر صرف اہل بیت علیہم السلام پر درود بھیجا جائے تو یہ مکروہ ہے، کیونکہ اس عمل میں شیعوں کے ساتھ

---

(۱) اہل سنت کے امام غزالی نے اس سلسلہ میں شیعوں کی مخالفت کی تصریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ثمّ تسطيع القبور ... أفضل من تسنيمها، لكنّ التسنيم الآن أفضل مخالفة لشعار الروافض ''قبروں کو ہموار بنانا بلند (اُونٹ کی کوھان کی طرح) بنانے سے بہتر ہے، لیکن اب قبروں کو بلند بنانا ہی بہتر ہے کیونکہ اس میں شیعوں کے طریقہ کار کی مخالفت ہے'' (الوسيط في المذهب (محمد الغزالی): ج ۱ ص ۳۶۱، كتاب الجنائز، طبع اول ۱۴۲۲ هجری، دار الكتب العلمية بيروت).

(۲) ...وانّما نخالفهم في هيئات مثل التختم في اليمين و أمثاله (حواله سابق)

(۳) سورہ الاحزاب(۳۳): آیت ۴۳

مشابہت پائی جاتی ہے‘‘(۱)، یعنی جب شیعوں نے آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں یہی طریقہ کار اختیار کرلیا تو بعض علماء نے مذہبی تعصب کی بنا پر اہل سنت مسلمانوں کو اس شرعی عمل سے منع کردیا۔

۳): صحیح بخاری کے شارح، ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) نے بھی اپنی کتاب میں ابن القیم کے قول کو نقل کرتے ہوئے آل نبی پر سلام بھیجنے سے منع کیا ہے اور یہی توجیہ پیش کی ہے کہ چونکہ یہ شیعوں کا شعار ہے لہذا اسے ترک کرنا چاہیے(۲)۔

ابن حجر نے اسی مسئلہ کو بڑھاتے ہوئے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ زندہ شخص پر سلام کے جائز ہونے میں سب علماء کا اتفاق ہے لیکن انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کسی دوسرے شخص پر سلام کرنے کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے، البتہ انبیاء کے علاوہ کسی اور پر تنہا سلام نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ شیعوں کا طریقہ ہے(۳)؛ علماء و محققین نے بعض اہل سنت علماء کے ایسے کئی فتاوی کو نقل کیا ہے جن میں شیعوں کی مخالفت کا خاص لحاظ کیا گیا ہے اور اسی مخالفت کی بنا پر شرعی حکم کو بدل کر فتوی دیا گیا ہے لیکن ہم مذکورہ نمونوں پر ہی اکتفاء کرتے ہیں۔

---

(۱) فان قلت: فما تقول في الصلاة على غيره؟ قلت: القياس جواز الصلاة على كلّ مومن، لقوله تعالى: ﴿هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُه﴾ وقوله تعالى: ﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ﴾ وقوله ﷺ: اللهم صلّ على آل أبي... وأما اذا أفرد غيره من أهل البيت بالصلاة كما يفرد هو، فمكروه ...لأنّه يؤدّي الى الاتهام بالرفض (الكشاف(زمخشری): ج۳ص ۵۵۸، طبع دار الكتاب العربی بيروت).

(۲) المختار أن يصلي على الانبياء والملائكة وازواج النبيّ وآله وذريته واهل الطاعة على سبيل الاجمال وتكره في غير الانبياء لشخص مفرد بحيث يصير شعارا ولاسيما اذا ترک في حق مثله او أفضل منه كما يفعله الرافضة فلو اتفق وقوع ذلک مفردا في بعض الاحايين من غير أن يتخذ شعارا لم يكن به بأس... (فتح الباری(ابن حجر عسقلانی): ج ۱۱ ص ۱۴۶، طبع دوم، دار المعرفة بيروت).

(۳) أختلف في السلام على غير الانبياء، بعد الاتفاق على مشروعيّته في تحيّة الحي، فقيل يشرع مطلقاً و قيل: بل تبعاً، ولا يفرد لواحد لكونه صار شعاراً للرافضة (حواله سابق)

2: کیا کسی دوسرے مذہب کی عقلی و منطقی باتوں کو کسی دلیل کے بغیر ردّ کرنا صحیح ہے؟!

یقیناً کوئی باشعور شخص کسی دوسرے کی عقلی و منطقی بات کو کسی قانع کنندہ دلیل کے بغیر صرف تعصب کی بنا پر ردّ نہیں کرسکتا، اور نہ ہی ایسا کرنا عقلی و اخلاقی طور سے صحیح ہے۔

بعض محققین نے اہل سنت مسلمان بھائیوں کی معتبر کتب میں موجود روایات اور اُن کے علماء کے بیان کردہ عقائد و نظریات پر کچھ عقلی و منطقی اعتراضات پیش کئے ہیں جنہیں صحیح طور سے حل کرنے کی بجائے صرف تعصب کی نذر کردیا جاتا ہے، جبکہ یہ اعتراضات امت مسلمہ کے عقائد و نظریات کی تصحیح میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔

ذیل میں ایسے ہی بعض نظریات پر عقلی و منطقی اعتراضات کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیں جن کے قانع کنندہ جوابات کی جستجو سے صاحبان اسلام کو راہ حق پہچاننے میں مدد ملے گی۔

۱): پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد امت اسلام کے درمیان سب سے پہلا متنازعہ مسئلہ جو امت محمدیہ کی یکجہتی اور مرکزیت کے خاتمہ کا سبب بنا، آپؐ کی خلافت و جانشینی کا مسئلہ تھا، اس سلسلہ سلسلہ میں اہل سنت علماء کا نظریہ ہے: ''حضورؐ نے اپنی زندگی میں کسی شخص کو بھی اپنا خلیفہ یا جانشین نامزد نہیں فرمایا تھا، بلکہ آپؐ نے خلیفہ کے انتخاب کا کام امت کے سپرد فرمایا کہ وہ اپنی مرضی سے جسے چاہیں خلیفہ معین کرلیں''۔

اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو یقیناً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ کام برحق، امت کے مفاد میں اور لوگوں کی ہدایت کی ضمانت ہے لہذا ہر مسلمان کیلئے ضروری ہے کہ وہ بھی خلافت کے سلسلہ میں آپؐ کے اسی عمل کی پیروی کرے کیونکہ آپؐ کا فعل تمام مسلمانوں کیلئے اسوہ حسنہ ہے(۱)؛ اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ جناب ابوبکر کا اپنے بعد جناب عمر کو اپنا خلیفہ نامزد کرنا سنّتِ رسولؐ کے مطابق نہیں تھا اور اسی

---

(۱) ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوْ اللهَ وَ...﴾ (سورہ احزاب: آیت ۲۱)

طرح جناب عمر کا خلیفہ کے انتخاب کیلئے چھ رکنی کمیٹی بنانا، نہ سنتِ رسولؐ کے مطابق تھا اور نہ ہی جناب ابوبکر کی سیرت کے مطابق تھا؛ اور اگر کہا جائے کہ جناب ابوبکر اور جناب عمر کا اپنے بعد اپنا خلیفہ اور جانشین نامزد کرنا اُمت کی مصلحت اور انکے مفاد میں تھا تو پھر (نعوذ باللہ) رسول اکرم ﷺ پر حرف آئے گا کہ آپؐ نے اپنی امت کی مصلحت کے پیش نظر اپنا خلیفہ و جانشین نامزد کیوں نہیں کیا؟!، لہذا یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ رسول خدا ﷺ نے امت کی مصلحت کیلئے یقیناً اپنا جانشین معین کیا تھا اور وہ جانشین حضرت علیؑ تھے جن کی جانشینی کا اعلان غدیر کے مقام پر ہوا تھا۔

۲): اہل سنت علماء کے نظریہ مطابق پیغمبر اکرم ﷺ نے کسی شخص کو اپنا خلیفہ یا جانشین نامزد نہیں فرمایا تھا بلکہ حضورؐ کی رحلت کے بعد لوگوں نے سقیفہ میں جمع ہو کر جناب ابوبکر کو خلیفہ چن لیا اور جناب ابوبکر نے اپنے بعد جناب عمر کو خلیفہ نامزد کیا، اور جناب عثمان جناب عمر کی معین کی ہوئی چھ رکنی کمیٹی کے ذریعہ منتخب ہوئے، اور دوسری طرف اہل سنت کا یہ بھی عقیدہ ہے: کہ یہ تینوں شخصیات پیغمبر اکرمؐ کے خلیفہ و جانشین تھے؛ ایسی صورت میں کیا یہ صحیح ہے کہ جنہیں رسول خدا ﷺ نے خود خلیفہ نہیں بنایا انہیں "خلیفة الرسولؐ" کہا جائے؟؟؟!!! جبکہ رسول اکرم ﷺ پر ہر قسم کا جھوٹ باندھنا گناہ عظیم ہے(۱)۔

پس اگر یہ دعوی صحیح ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے کسی کو خلیفہ معین نہیں فرمایا تھا، تو پھر آپؐ کے بعد کسی خلیفہ کو بھی "خلیفة الرسولؐ" کہنا صحیح نہیں ہوگا، کیونکہ آپؐ کا حقیقی خلیفہ و جانشین صرف وہی ہو سکتا ہے جسے آپؐ نے خود اپنا خلیفہ و جانشین نامزد فرمایا ہو۔

---

(۱) مَن كذب عليّ متعمدا فليتبّؤ مقعده من النّار (صحيح البخاری: ج ۱ ص ۳۶؛ ج ۲ ص ۸۱؛ ج ۴ ص ۱۴۵؛ ج ۷ ص ۱۱۸، قال ابن الجوزی: رواه من الصحابة ثمانية وتسعون نفساً "ابن جوزی نے کہا ہے کہ اس حدیث کو ۹۸ صحابہ نے بیان کیا ہے").

۳): صحیح بخاری، صحیح مسلم اور اہل اسلام کی دیگر معتبر کتب میں روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: **فاطمة بضعة منّي فمن أغضبها أغضبني** ''فاطمہ علیہا السلام میرا ٹکڑا ہے جس نے اُسے ناراض کیا اُس نے مجھے ناراض کیا(۱)؛ اور دوسری طرف اُسی صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں یہ روایت بھی ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا علیہا السلام خلیفہ اول پر اتنا ناراض ہوئیں کہ اپنی وفات تک اُن سے بات کرنا گوارا نہ کی، چنانچہ بخاری نے نقل کیا ہے: **فغضبت فاطمة بنت رسول الله فهجرت أبابكر فلم تزل مهاجرته حتّى توفّيت** ''حضرت فاطمہ علیہا السلام غضبناک ہوئیں اور جناب ابوبکر سے ناراض ہو گئیں، اور آپؑ کی جناب ابوبکر سے ناراضگی ختم نہ ہوئی یہاں تک کہ آپؑ کا انتقال ہو گیا''(۲)؛ جبکہ قرآن مجید کا واضح ارشاد ہے: ﴿**إِنَّ الَّذِينَ يُؤْذُونَ اللهَ وَرَسُولَهُ لَعَنَهُمُ اللهُ فِي الدُّنيَا وَالآخِرَةِ وَأَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُهِينًا**﴾(۳) ''جو لوگ اللہ اور اسکے رسول کو اذیت دیتے ہیں اُن پر دنیا و آخرت میں اللہ کی لعنت ہے اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے''؛ کیا مکتب خلفاء کے پیروکار مسلمانوں کے پاس اس مشکل مسئلے کا کوئی حل یا حضرت فاطمہ علیہا السلام کی خلیفہ اول سے ناراضگی کی کوئی توجیہ ہے؟

۴): اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق ''اگر کوئی مسلمان کسی بھی صحابی کے بارے میں کوئی ایسی بات کرے جو عام لوگوں کی نظر میں کسی محترم شخص کے لائق نہ ہو، تو چاہے وہ بات حقیقت پر مبنی ہی

---

(۱) صحیح بخاری: ج۴ص ۲۱۰. کتاب فضائل الصحابة، باب قرابة رسول الله؛ وفي رواية مسلم: " انّما فاطمة بضعة منّي يؤذيني ما آذاها"(صحیح مسلم: ج۷ص ۱۴۱، کتاب فضائل الصحابة، باب فضائل فاطمة)؛ روى الحاكم: "يا فاطمة، انّ الله يغضب لغضبكِ ويرضى لرضاكِ (المستدرک (حاکم): ج۳ص ۱۵۳).

(۲) صحیح بخاری، ج۴ص ۴۲، کتاب المغازی، باب غزوة خيبر.

(۳) سورہ احزاب(۳۳): آیت ۵۷.

کیوں نہ ہو پھر بھی ایسی بات بیان کرنے والا شخص توہین صحابی کا مجرم، دین کے دائرہ سے باہر، منافق یا فاسق ہے''؛ ایسا عقیدہ اور نظریہ پیش کرنے والے مسلمان اُس شخص کے بارے میں کیا فتوی دیں گے جس نے حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ جنگ کی، آپؑ پر عرصہ دراز تک سَبّ وشَتم کیا اور اُس کی کوششوں کی بدولت اُسوقت تمام مملکت اسلامیہ میں حضرت علیؑ پر سَب وشَتم اور لعن طعن کا قبیح عمل رائج ہوگیا اور عرصہ دراز تک جاری رہا!!!

۵): اہل سنت دینی و مذہبی احکام میں چار اماموں (امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام حنبل) میں سے کسی ایک کی پیروی کو ضروری سمجھتے ہیں، ان چار میں سے سب سے پہلے امام ابوحنیفہ ہیں جن کی ولادت ۸۰ ہجری میں ہوئی(۱)، یعنی آپ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے ۶۹ سال بعد پیدا ہوئے، جبکہ شیعہ حضرت امام علیؑ سے لیکر حضرت امام مھدیؑ تک بارہ اماموں کو مانتے ہیں جن میں سے سب سے پہلے امام حضرت علیؑ ہیں، آپؑ کی ولادت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے تقریباً دس سال پہلے ہوئی اور آپؑ نے اپنی ساری زندگی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ گزاری اور آپؑ ہی نے سب سے پہلے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی؛ لہذا کیا دینی و مذہبی احکام میں حضرت امام علیؑ اور آپ کی معصوم اولاد علیہم السلام کی پیروی کرنے والوں کی حقانیت میں شک کیا جا سکتا ہے؟!!

ہرگز نہیں، بلکہ ہر مسلمان نہایت آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کے حصول کے لئے آپؐ کے اہل بیت علیہم السلام کی پیروی کرنا زیادہ بہتر ہے، اسی لئے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں کئی بار اپنی امت کو اپنے اہل بیت علیہم السلام کی پیروی کرنے کا حکم بھی دیا ہے اور انہی کی پیروی کو نجات کی ضمانت قرار دیا ہے، چنانچہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''میں تم میں دو چیزیں چھوڑے

---

(۱) الطبقات الکبری(ابن سعد): ج۶ ص۳۶۸؛ البدایة والنهایة: ج۱۰ ص۱۰۸ و دیگر تاریخی کتب.

جا رہا ہوں، اللہ کی کتاب اور میری عترت واہل بیت علیہم السلام، اگر ان دونوں کا دامن تھامے رکھو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہوگے''(۱)۔

کیا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس واضح اعلان کے بعد اہل بیت علیہم السلام کو چھوڑ کر کسی اور کی پیروی کا کوئی جواز ہے؟

ایسے ہی بہت سے اور بھی سوالات ہیں جن کے جوابات کی تلاش سے راہِ حقیقت کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے اور ہر صاحبِ فکر و دانش مسلمان ایسے سوالات کے ذریعہ نہایت آسانی کے ساتھ حقیقت کو پا سکتا ہے؛ البتہ چونکہ ایسے تمام سوالات اور عقائد و نظریات کو اس مختصر کتاب میں بیان کرنا ممکن نہیں ہے لہذا صرف اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حرف آخر: ہم اپنی اس مختصر کتاب کا اختتام اُسی جملہ سے کرتے ہیں جو حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا: ﴿... إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ﴾ ''...میں تو صرف اصلاح چاہتا ہوں جہاں تک میرے امکان میں ہو، میری توفیق صرف اللہ سے وابستہ ہے، میرا صرف اُسی پر بھروسہ ہے اور میں اُسی کی طرف متوجہ ہوں''(۲)۔

والسلام علی من اتبع الهدی

سیّد توقیر عباس کاظمی

Email: tqrkazmi@yahoo.com

---

(۱) یہ حدیث ''حدیث ثقلین'' کے نام سے مشہور ہے، اس حدیث پر تمام اسلامی مذاہب کا اتفاق ہے اور تمام صاحب نظر و معتبر علماء اسے متفقہ حدیث کے طور پر قبول کرتے ہیں، یہ حدیث مختلف مضامین کے ساتھ اہل سنت کی حدیث کی صحیح ترین کتب مثلاً سنن ترمذی: ج ۵ ص ۶۲۱، مسند احمد، مستدرک حاکم، معجم کبیر طبرانی وغیرہ میں ذکر ہوئی ہے۔

(۲) سورہ ھود (۱۱): آیت ۸۸

اس کتاب کی تالیف میں جن کتب سے استفادہ کیا گیا

(۱)قرآن کریم (کتاب الله تعالی).

(۲)نهج البلاغه (امام علی بن أبی طالب)، ط دارالمعرفة بیروت.

حروف تہجی کی ترتیب سے کتب کے نام:

(۳)الاتقان فی علوم القرآن (جلال الدین سیوطی):ط الأولی۱۴۱۶ق، دار الفکر بیروت.

(۴)الاحتجاج (أحمد بن علی طبرسی):(تحقیق سید محمد باقر الخرسان :۲جلدی)، ط منشورات دار النعمان للطباعة والنشر.

(۵) اسد الغابة (المعروف بابن الاثیر):۵جلدی، انتشارات اسماعیلیان، تهران.

(۶)الاصابة فی تمییز الصحابة (احمد بن علی ابن حجر شافعی عسقلانی): تحقیق شیخ عادل، ۸جلدی،طبع اول ۱۴۱۵، دار الکتب العلمیة بیروت.

(۷)اعجاز القرآن (ابوبکر محمد بن الطیب الباقلانی):تحقیق أحمد صقر، طبع دوم، دار المعارف مصر.

(۸)الامامة والسیاسة معروف بتاریخ الخلفاء(ابن قتیبة): تحقیق الزینی، ط اول ۱۴۱۳، ناشر :مؤسسة الحلبی وشرکاه للنشر والتوزیع، قاهرة.

(۹)انساب الاشراف (أحمد بن یحیی البلاذری):تحقیق محمودی، طبع اول ۱۳۹۴ش، ناشر مؤسسة الاعلمی بیروت.

(۱۰)بحار الأنوار (مجلسی):ط الثانیة۱۴۰۳هجری، مؤسسة الوفاء بیروت.

(۱۱)بدایة المجتهد ونهایة المقتصد (محمد بن احمد القرطبی الاندلسی):تحقیق خالد العطار، ۲جلدی، طبع ۱۴۱۵، دار الفکر بیروت.

(۱۲)البدایة والنهایة (ابن کثیر): طبع اول ۱۴۰۸، دار احیاء التراث العربی بیروت.

(۱۳)البدایة والنهایة (اسماعیل ابن کثیر): تحقیق علی شیری، ۱۴ جلدی، طبع اول ۱۴۰۸، دار احیاء التراث العربی، بیروت.

(۱۴)البرهان فی علوم القرآن (زرکشی): ط اول ۱۳۷۶هـ ق، (تحقیق ابوالفضل ابراهیم، 4مجلدات)،

دار أحياء الكتب العربية القاهرة.

(۱۵)البيان فی تفسير القرآن(خوئی): ط چهارم 1975، دار الزهراء بيروت.

(۱۶)تاريخ ابن خلدون (العلامة ابن خلدون): طبع چهارم، ۸جلدی، دار احياء التراث العربی، ناشر مؤسسة الاعلمی بيروت.

(۱۷)تاريخ الامم والملوک معروف به تاريخ طبری (ابن جرير طبری):تحقيق نخبة من العلماء، ۸جلدی، ناشر مؤسسة الاعلمی بيروت.

(۱۸)تاريخ اليعقوبی (أحمد بن أبی يعقوب): ۲جلدی، طبع دار صادر بيروت، ناشر موسسة ونشر فرهنگ اهل بيت قم.

(۱۹) تاريخ بغداد (ابی بكر خطيب بغدادی): تحقيق عطا، طبع اول ۱۴۱۷ء، دار الكتب العلمية بيروت.

(۲۰)تاريخ مدينة دمشق (ابن عساكر): تحقيق شيری، طبع۱۴۱۵ء، دارالفكر بيروت.

(۲۱)التبيان فی تفسير القرآن (أبو جعفر طوسی): تحقيق أحمد حبيب قصير العاملی، ط الأولی ۱۴۰۹ء، مكتب الاعلام الاسلامی.

(۲۲)تفسير الجامع لاحكام القرآن (القرطبی): طبع ۱۴۰۵ء، ۲۰جلدی، ناشر مؤسسة التاريخ العربی بيروت.

(۲۳)تفسير القرآن العظيم (اسماعيل ابن كثير):طبع ۱۴۱۲ء، ۴جلدی، دار المعرفة بيروت.

(۲۴)تفسير مجمع البيان (ابو علی الفضل الطبرسی):تحقيق لجنة من العلماء، طبع اول ۱۴۱۵ء، ۱۰جلدی، ناشر مؤسسة الاعلمی بيروت.

(۲۵)تفسير مفاتيح الغيب (فخر رازی): طبع بيروت.

(۲۶)جامع البيان(ابن جرير طبری): تحقيق جميل العطار، ۳۰جزء، طبع ۱۴۱۵ء، دار الفكر بيروت.

(۲۷)الجامع الصغير (جلال الدين سيوطی): ۲جلدی، طبع اول ۱۴۰۱ء، دار الفكر بيروت.

(۲۸)الدر المنثور(جلال الدين سيوطی):۶جلدی، طبع اول ۱۳۶۵ء؛ ناشر دارالمعرفة للطباعة والنشر بيروت.

(۲۹)ذخائر العقبی فی مناقب ذوی القربی (احمد بن عبدالله الطبری):طبع ۱۳۵۶ء، ۱جلدی، ناشر :مكتبة القدسی.

(۳۰)روح المعانی(آلوسی):چاپ دار احياء التراث العربی.

(۳۱)زاد المسیر (ابن الجوزی):تحقیق محمد بن عبدالرحمن، طبع اول ۱۴۰۷ھ، ۸جلدی، دار الفکر بیروت.

(۳۲)سلیم بن قیس الهلالی (ابو صادق سلیم الکوفی):تحقیق شیخ باقر، ۱ جلدی.

(۳۳)سنن ابن ماجة (محمد بن یزید القزوینی):تحقیق عبدالباقی، ۲جلدی، دار الفکر بیروت.

(۳۴)سنن أبی داؤد(أبی داؤد):(محقّقة)، ط اول ۱۴۱۰ه، دار الفکر بیروت.

(۳۵)سنن أبی داود (سلیمان بن الاشعث السجستانی):تحقیق سعید محمد اللحام، ۲جلدی، طبع اول ۱۴۱۰ھ، ناشر دار الفکر بیروت.

(۳۶)سنن الترمذی (محمد بن عیسی):تحقیق:عبد الرحمان محمد عثمان، 5 :مجلدات، ط الثانیة۱۴۰۳ه دار الفکر بیروت.

(۳۷)سنن النسائی (أحمد بن شعیب النسائی):۸جلدی، طبع اول ۱۳۴۸ھ،۱۹۰۳ھ، دارالفکر بیروت.

(۳۸)سیر اعلام النبلاء (ذهبی):تحقیق شعیب الارنؤط،۲۳ جلدی، طبع نهم ۱۴۱۳ھ، ناشر مؤسسة الرسالة بیروت.

(۳۹) سیر اعلام النبلاء (ذهبی):تحقیق شعیب، طبع نهم ۱۴۱۳ھ، ناشر مؤسسة الرسالة بیروت.

(۴۰) سیرة ابن هشام (محمد بن اسحاق):تحقیق محمد محیی الدین، ۴جلدی، طبع ۱۳۸۳ھ، ناشر مکتبة محمد علی صبیح.

(۴۱)شرح صحیح مسلم (النووی):۱۸ جلدی، طبع دوم ۱۴۰۷ھ، دار الکتب العربی بیروت.

(۴۲)شرح نهج البلاغة (ابن أبی الحدید):تحقیق ابوالفضل، ط منشورات مکتبة المرعشی قم، ناشر دار أحیاء الکتب العربیة.

(۴۳)شواهد التنزیل لقواعد التفضیل (حاکم حسکانی):تحقیق شیخ محمد باقر محمودی، ط الأولی ۱۴۱۱ھ، مجمع أحیاء الثقافة الاسلامیة.

(۴۴)شیعه شناسی و پاسخ به شبهات (علی اصغر رضوانی):طبع دار الحدیث قم.

(۴۵)صحیح البخاری (محمد بن اسماعیل):۸ جلدی، ناشر دار الفکر بیروت ۱۴۰۱ه.

(۴۶)صحیح مسلم (مسلم):۸ جلدی، ناشر دار الفکر بیروت.

(۴۷)الطبقات الکبری (ابن سعد):۸جلدی، ناشر دار صادر بیروت.

(۴۸)علل الشرایع (شیخ صدوق):طبع ۱۳۸۶ھ،المکتبة الحیدریة النجف.

(۴۹)عوالی اللألی العزیزیة فی الاحادیث الدینیة(ابن ابی جمهور احسائی):تحقیق مجتبی العراقی،

۴جلدی، طبع اول ۱۴۰۳ھ، سید الشهداء قم.
(۵۰)فتح الباری شرح صحیح البخاری (ابن حجر عسقلانی):طبع دوم، ۱۳ جلدی، ناشر :دار المعرفة للطباعة والنشر بیروت لبنان.
(۵۱)فتح القدیر (الشوکانی):۵جلدی، ناشر عالم الکتب.
(۵۲)الفصول المختارة (شیخ مفید):طبع دوم ۱۴۱۴ھ، دار المفید بیروت.
(۵۳)فیض القدیر شرح الجامع الصغیر (محمد عبد الرؤف المناوی):طبع اول ۱۴۱۵ھ، دار الکتب العلمیة بیروت.
(۵۴)الکافی (کلینی):(تحقیق علی اکبرغفاری)، ط سوم ۱۳۸۸ھ، دار الکتب الإسلامیة آخوندی.
(۵۵)الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل(زمخشری):طبع سوم، دار الکتاب العربی، سنه۱۴۰۷ه؛۱۹۸۷ء.
(۵۶)کنز العمال (متقی هندی):تحقیق شیخ بکری و شیخ صفوة السقا،۱۶ جلدی، طبع مؤسسة الرسالة بیروت، لبنان.
(۵۷)لسان المیزان (ابن حجرعسقلانی):طبع دوم ۱۹۹۰ھ، ۷جلدی، ناشر مؤسسة الاعلمی للمطبوعات، بیروت.
(۵۸)مجمع البیان (أبو علی الفضل طبرسی):ط اول۱۴۱۵ھ، مؤسسة الاعلمی للمطبوعات بیروت.
(۵۹)مجمع الزوائد ومنبع الفوائد (نور الدین هیثمی):طبع ۱۴۰۸ ، ۱۹۸۸ء، ۱۰جلدی، ناشر دار الکتب العلمیة بیروت، لبنان.
(۶۰)المحلی (ابن حزم الاندلسی): تحقیق احمد محمد شاکر، ۱۱جلدی، دار الفکر بیروت.
(۶۱)مسائل خلافیة حار فیها أهل السنة (علی آل محسن): طبع دوم، دارالهادی بیروت لبنان.
(۶۲)المستدرک علی الصحیحین (حاکم نیسابوری): تحقیق مرعشلی، دار المعرفة بیروت۱۴۰۶ھ.
(۶۳)مسند (أحمد بن حنبل): ۶جلدی، ط دار صادر بیروت.
(۶۴)المصنف (ابن ابی شیبة الکوفی): تحقیق سعید محمد اللحام، ۸جلدی، طبع اول ۱۴۰۹ھ، دار الفکر بیروت.
(۶۵)المعجم الکبیر (سلیمان بن احمد الطبرانی):تحقیق حمدی عبد المجید،طبع دوم، ۲۵ جلدی، ناشر مکتبة ابن تیمیة قاهره.
(۶۶)المعجم الاوسط (سلیمان بن احمد الطبرانی): تحقیق ابراهیم، طبع دار الحرمین، ۹جلدی.

(۶۷)مقاتل الطالبين (أبوالفرج الاصفهانی):تحقيق كاظم المظفر، طبع دوم مكتبه حيدرية، ناشر مؤسسة دار الكتاب قم.

(۶۸)المناقب (الموفق الخوارزمی):تحقيق محمودی، طبع دوم ۱۴۱۱ه، مؤسسة النشر الاسلامی قم.

(۶۹)مناقب آل أبي طالب (ابن شهر آشوب):۳جلدی، طبع ۱۳۷۶ه، مطبعة حيدريه النجف.

(۷۰)ميزان الاعتدال (ذهبی):تحقيق بجاوی، ۴جلدی، طبع اول ۱۳۸۲ه، ناشر دار المعرفة بيروت.

(۷۱) الميزان في تفسير القرآن(محمد حسين طباطبائی):الناشر مؤسسة النشر الإسلامی التابعة لجامعة المدرسين قم.

(۷۲)النهاية في غريب الحديث (ابن الاثير):تحقيق طاهر الزاوی، طبع چهارم ۱۳۶۴ش، ناشر مؤسسة اسماعيليان.

(۷۳)نيل الاوطار من أحاديث سيد الاخبار (محمد بن علی الشوكانی): ۹جلدی، ناشر دار الجليل بيروت.

(۷۴)الوسيط في المذهب (محمد الغزالي): طبع اول۱۴۲۲ هجری، دار الكتب العلمية بيروت.

(۷۵) ينابيع المودة (قندوزی حنفی):تحقيق اشرف حسينی؛ ۳ جلدی، طبع اول ۱۴۱۶ه، دار الاسوة.

ضروری نوٹ

بحمدللہ کتاب **ردّ الشبہات** کا دوسرا ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے جس میں پہلے ایڈیشن کی نسبت کچھ ضروری اصلاحات کر دی گئی ہیں، اور بھرپور کوشش کی گئی ہے کہ کسی مقام پر کوئی ایسا جملہ تحریر نہ کیا جائے جس سے کسی مسلمان کے عقیدہ ونظریہ کو ٹھیس پہنچے، نیز اس کتاب میں نقل شدہ روایات واحادیث کو مکمل حوالہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے تاکہ کوئی متعصب وجاہل شخص سادہ لوح عوام کو فریب نہ دے سکے۔

تمام قارئین سے گزارش ہے کہ وہ اس کتاب کا بغور اور صبر وتحمل کے ساتھ مطالعہ فرمائیں، اور اگر کسی طرح کی مزید اصلاح یا کسی مسئلہ میں مزید وضاحت کی ضرورت محسوس کریں تو ایمیل وغیرہ کے ذریعہ ضرور مطلع فرمائیں تاکہ آئندہ ایڈیشن میں مزید اصلاح کی جاسکے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

المصطفیٰ اسلامک سنٹر کا مختصر تعارف

المصطفیٰ اسلامک سنٹر گوجرانوالہ ایک دینی و مذہبی اور علمی و ثقافتی ادارہ ہے جسے رسول خدا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے مبارک نام سے منسوب کیا گیا ہے، اور یہ ادارہ ضلع گوجرانوالہ کے نہایت اہم اور مرکزی حیثیت کے حامل علاقہ " کھیالی بائپاس " میں قائم کیا گیا ہے۔

المصطفیٰ اسلامک سنٹر کے قیام کی ضرورت:

اللہ تعالی کے آخری رسول، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے اسلام کے عنوان سے علم وہدایت کا ایسا بے مثال اور لازوال چراغ روشن کیا جو رہتی دنیا تک انسانیت کے لئے راہ ہدایت اور ہر طرح کی مشکلات سے نجات کا ذریعہ ہے۔

دین اسلام پیغمبر اکرم ﷺ کی پاک و پاکیزہ زندگی کا ماحصل جسے آپؐ کے اہل بیت علیہم السلام اور جانثار ساتھیوں نے نہایت جانفشانی کے ساتھ حفاظت و پاسبانی کرتے ہوئے ہم تک پہنچایا؛ لیکن عصر حاضر میں یہ عظیم میراث ہم مسلمانوں ہی کی لاپرواہی اور ناقدری کے سبب تنکنائیوں کا شکار ہو کر اپنی عمومی افادیت کو عام کرنے سے محروم دکھائی دیتی ہے، اسلام دشمن طاقتیں بھی مسلمانوں کی اسی لاپرواہی اور بے حسی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام و مسلمین کو دنیا کے سامنے ذلت ورسوائی سے دچار کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں، لہذا کبھی پیغمبر اکرم ﷺ کے خاکے بنائے گئے اور کبھی قرآن پاک جلانے کی ناپاک حرکت کی گئی؛ کبھی دہشتگردی اور فرقہ واریت کے ذریعہ اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اور کبھی مسلمانوں کے درمیان اختلاف وانتشار پھیلانے کے لئے خطرناک ہتھکنڈے استعمال کئے جارہے ہیں؛ اور اس کے ساتھ ساتھ آج کے

اس ترقی یافتہ دور میں ڈش، انٹرنٹ، کیبل اور دیگر جدید ٹیکنالوجی کے ذریعہ مسلمان جوانوں کے ایمان کو ضائع کرنے کی کوششیں بھی کی جارہی ہیں۔

ایسے میں مسلمانوں کے درمیان فکری یکجہتی کے فروغ کے ساتھ ساتھ، قرآن واہل بیت علیہم السلام کے بیانات پر مبنی خالص اسلامی تعلیمات کو معاشرے میں عام کرنا اور خاص طور پر قوم کے جوانوں کے ذہنوں کو خالص اسلامی تعلیمات و مذہبی اقدار سے مانوس کرنا وقت کی ایک اہم ضرورت ہے، اور اسی بنیادی نکتہ کے پیش نظر **المصطفیٰؐ اسلامک سنٹر گوجرانوالہ** کا قیام عمل میں آیا ہے۔

المصطفیٰؐ اسلامک سنٹر کا نصب العین:

المصطفیٰؐ اسلامک سنٹر کا نصب العین "معاشرے میں اسلامی ثقافت کی ترویج" ہے؛ کیونکہ اسلام ایک ایسا ضابطہ حیات ہے جو نہ صرف فکری وعلمی پہلوؤں سے لیس ہے بلکہ تربیتی وعملی پہلوؤں کا بھی حامل ہے؛ اور جب دینی اعتقادات اور مذہبی معلومات کو عملی صورت میں پیش کیا جاتا ہے تو "اسلامی ثقافت" وجود میں آتی ہے؛ پس اسلامی ثقافت ایک ایسا عام مفہوم ہے جس میں تمام اسلامی علوم، فنون، عقائد، احکام، اخلاقیات، عادات ورسوم اور تمام اسلامی رجحانات شامل ہیں؛ دوسرے لفظوں میں ثقافت کا مفہوم کسی معاشرے کے اعتقادات سمیت اُن کی عملی زندگی کے تمام مراحل کو شامل ہے، یہی وجہ ہے کہ "اسلامی ثقافت کی ترویج" کو **المصطفیٰؐ اسلامک سنٹر** کا نصب العین قرار دیا گیا ہے۔

المصطفیٰؐ اسلامک سنٹر کے بنیادی اصول:

i: ہر طرح کی کارکردگی میں خالص اسلامی تعلیمات کو محور قرار دینا

ii: قرآن مجید اور عترتِ رسول ﷺ کے احکامات وفرامین کی پیروی کرنا

iii: تمام مذاہب کے نظریات کا احترام اور مذہبی مسائل میں تعصب کے بغیر علمی گفتگو کا قائل ہونا

iv: وحدتِ اسلامی وایمانی اور وسیع قومی مفادات کی حفاظت و پاسداری کرنا

v: ہر طرح کی کارکردگی میں اخلاص، صداقت، امانتداری اور اسلامی آداب کا لحاظ کرنا

المصطفیٰؐ اسلامک سنٹر کے اہداف ومقاصد:

i: خالص اسلامی نظریات اور دینی و مذہبی اقدار کی ترویج

ii: اسلامی مذاہب کے پیروکار مسلمانوں کے درمیان ہمفکری و یکجہتی پیدا کرنا

iii: حقیقی اسلامی نظریات اور مکتبِ اہل بیتؑ کا دفاع، اور ہر طرح کے مذہبی شبہات واعتراضات کے علمی جواب دینا

iv: اہل بیتؑ کی عظیم علمی میراث کو اپنے صحیح خدوخال میں معاشرے تک پہنچانا

v: معاشرے میں اہل بیتؑ کی محبت ومودّت بڑھانے کی کوشش کرنا

vi معاشرے کے جوانوں کو خالص اسلامی افکار اور مکتبِ اہل بیتؑ سے روشناس کروانا

vii: بچوں اور نوجوانوں کو اسلامی معارف کے حصول کی ترغیب دلانا

ہمیں امید ہے کہ آپ تمام مومنین اپنا دینی و مذہبی اور اخلاقی فریضہ سمجھتے ہوئے ہر ممکن طور سے **المصطفیٰؐ اسلامک سنٹر گوجرانوالہ** کے معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔

سید توقیر عباس کاظمی

email:tqrkazmi@yahoo.com

مؤلف کے علمی وتحقیقی آثار

۱: ردّ الشبہات (اہل تشیع پر ہونے والے مشہور اعتراضات کے جوابات کا مجموعہ):

یہ کتاب اصلاحات اور اضافات کے ساتھ دوسری مرتبہ طبع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

۲: نظریہ عدالت صحابہ (قرآن وسنت کی روشنی میں):

یہ کتاب عدالتِ صحابہؓ کے نظریہ پر ایک مفصل تحقیق ہے جس میں صحابہ کرام کی عدالت کے بارے میں فریقین کے نظریات کو بیان کرتے ہوئے قرآن وسنت کی روشنی میں ان نظریات کا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے، یہ کتاب عدالت صحابہ کے نظریہ پر ایک منصفانہ تحقیق ہے جس میں صحابہ کرام کے بارے میں اہل سنت کا عقیدہ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ شیعہ نکتہ نظر کو بھی بیان کیا گیا ہے۔

۳: ولادت امام مہدیؑ اور عصر غیبت میں وجودِ امام کے فوائد:

اس کتاب کے پہلے حصہ میں امام مہدیؑ کے بارے میں فریقین کے نظریات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ احادیث وتاریخ کی کتب سے امام مہدیؑ کی ولادت کو ٹھوس دلائل کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے، اور کتاب کے دوسرے حصہ میں عصر غیبت میں امام مہدیؑ کے وجود کے فوائد پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

۴: دربارِ یزید میں سیدہ زینب سلام اللہ علیہا کا خطاب (مکمل ترجمہ اور تشریح کے ساتھ): زیر طبع

یہ کتاب، دربارِ یزید میں سیدہ زینب سلام اللہ علیہا کے خطبہ کا مکمل ترجمہ اور تشریح ہے، اور اس میں اہل بیت سلام اللہ علیہم کے فضائل ومصائب کو رسول زادی عقیلہ بنی ہاشمؑ کے خطبہ کو بنیاد بناتے ہوئے تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، تقریباً ۷۰ صفحہ پر مشتمل یہ کتاب عنقریب منظر عام پر آرہی ہے۔